خاک کی مہک
(افسانے)
ناصر عباس نیر

خاک کی مہک

(افسانے)

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4394 Nasir Abbas Nayyer, Dr.
Khaak Ki Mehak/ Dr. Nasir Abbas Nayyer.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2016.
160pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2016ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2983-9
ISBN-13: 978-969-35-2983-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

خاک کے اس ٹکڑے کے نام جس کی
مہک نے یہ کہانیاں لکھوائی ہیں۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ
(مولانا جلال الدین رومی)

فکشن مکڑی کے جالے کی طرح ہے، جو شاید ذرا سا اٹکا ہوا ہے، مگر چاروں طرف سے زندگی سے وابستہ ہے۔ یہ وابستگی مشکل ہی سے سمجھی جاتی ہے۔

ماخوذ: ورجینیا وولف

فہرست

کہانی کا کوہِ ندا

ہمارے فکشن کے سر احمد ہر پیریڈ کا آغاز اس سوال سے کرتے، کچھ نیا پڑھا؟ سب کی گردنیں جھک جاتیں۔ خدا جانے انھیں جھکی گردنیں دیکھنے کا شوق تھا یا وہ ہمیں پڑھنے کی تحریک دینے سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں کوئی بات وثوق سے کہنا مشکل تھا۔ ایک ہلکا سا اسرار بھی ان کی شخصیت میں تھا۔ شاید اس لیے کہ ان سے ہماری ملاقات صرف کلاس میں ہوتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کسی طالب علم سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنے کمرے میں بھی تھوڑا وقت گزارتے۔ ہم ان کے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے، جو ہمیشہ آدھا کھلا رہتا، انھیں کن انکھیوں سے دیکھتے۔ وہ کتابیں پڑھ رہے ہوتے یا کسی ملنے والے سے بات چیت کر رہے ہوتے۔ ایک دن انھوں نے کلاس میں آتے ہی یہی سوال کیا تو میں نے جرأت کر کے انھیں بتایا کہ سر ہماری ایم فل کی کلاس میں زیادہ تر لوگ ضرورتاً پڑھتے ہیں۔ کوئی پوری کتاب نہیں پڑھتا۔ صرف متعلقہ حصہ یا حصے پڑھ لیے تو سمجھا اپنی سات پشتوں پر احسان کیا۔ اکثر تو کتاب کے متعلقہ حصے کی فوٹو کاپی بنوا لیتے ہیں۔ نصاب میں ناول شامل ہیں، مگر اس پر تنقید پڑھ کر پرچہ دیں گے۔ انھوں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ ہر شخص کو اپنے متعلق فیصلوں کا حق ہے۔ میں نے مزید جرأت کی۔ سر، پھر آپ روز یہ سوال پوچھ کر ان کے نہ پڑھنے کے فیصلے پر کیا اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتے؟ سب نے سمجھا کہ سر احمد اس بات پر تو ضرور ڈانٹیں گے، اور ہم چاہتے تھے کہ وہ ڈانٹیں.... ان کی ڈانٹ بس اس قدر ہوتی کہ مولانا خدا کا خوف کرو، طالب علم خاتون ہوتی تو بس یہ کہتے میڈم اللہ سے ڈرا کرو، مگر انھوں نے اس روز ایک لمحے کی

خاموشی اختیار کی۔ پھر اتنا کہا: ہونہہ، تم بہت چالاک ہو۔ میں تمھیں تھوڑی کہتا ہوں کہ فلاں پڑھو، فلاں نہیں پڑھو۔ میں صرف پڑھنے کے لیے کہتا ہوں۔ ایک کتاب کا انتخاب اتنا ہی اہم ہے جتنا اہم... اپنے لیے شریک حیات کا انتخاب کا معاملہ ہے۔ سب مسکرا دیے۔ لیکن سر اگر کوئی شریک حیات نہ چاہے؟ میں نے شرارت کی۔ بہت سے لوگ کتابیں نہیں پڑھتے، سنی سنائی باتوں کو کافی جانتے ہیں، اور بہت سوں کے حساب سے کامیاب زندگی جیتے ہیں۔ سر اب سنجیدہ تھے، لیکن یاد رکھو، ایک کتاب کا انتخاب ایسا ہی ہے، جیسے اپنی موت کے طریقے کا انتخاب کرنا، یعنی اتنا ہی سنجیدہ اور اتنا ہی گمبھیر، اور اتنا ہی غیر معمولی معاملہ، اور یہ بھی یاد رکھو جس طرح اپنی موت کے انتخاب کا موقع کسی کسی کو ملتا ہے، اپنے لیے کتاب کے انتخاب کا موقع بھی کسی کسی کو ملتا ہے۔ کیا خیال ہے مولانا؟ انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جی سر سمجھ گیا۔

سر ذرا سے خاموش ہوئے تو میں نے کچھ اور جرأت دکھائی اور کہا، سر ہماری کلاس میں صرف تین چار طالب علموں کو فکشن پڑھنے کا شوق ہے۔ رفیق اردو فکشن اور لاطینی امریکی فکشن کے ترجمے شوق سے پڑھتا ہے۔ سمیرا، حمیرا، اقرا اور ارو ما زیادہ تر عمیرہ احمد کو پڑھتی ہیں۔ ان تینوں نے مجھے گھور کر دیکھا، جیسے میں نے ان کی ذاتی زندگی کے کسی پہلو سے پردہ اٹھا دیا ہو۔ یہ بات مجھے کافی دنوں بعد سمجھ آئی کہ پاپولر فکشن پڑھنے والے اس کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں شاید کسی سماجی احتساب کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ بات بھی مجھے بہت عرصے بعد سمجھ آئی کہ جن باتوں پر سماج کے احتساب کا ڈر ہو، وہ سب سے زیادہ توجہ سے سنی اور کی جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ سر احمد ہی نے کہا کہ طلسم ہوش ربا کے بعض حصے ایسے ہیں کہ وہ انھیں کلاس میں نہیں پڑھ سکتے، اگلے دو تین دنوں میں لائبریری سے اس داستان کی سب کا پیاں طالب علموں نے جاری کروالیں۔

کلاسیں شروع ہوئے، ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ ایک دن سر احمد نے کلاس کا آغاز اپنے معمول کے سوال سے نہیں کیا۔ سب حیران ہوئے۔ کہنے لگے، مجھے پہلے ہفتے آپ کو بتا دینا چاہیے تھا کہ آپ کو اس سیمسٹر میں اسائنمنٹ بھی لکھنا ہے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ کہیں گے، فکشن کی ایک ایک کتاب پکڑیں اور اس پر اسائنمنٹ لکھ دیں۔ اس بہانے کتاب بھی پڑھی جائے گی، مگر انھوں نے یہ کہہ کر مزید

حیران کر دیا کہ سب لوگ کہانیاں جمع کریں گے۔ انھوں نے شاید ہمارے چہروں کو پڑھ لیا، اسی لیے کہا کہ آپ سب سوچ رہے ہوں گے کہ اسائمنٹ تحقیق کا حصہ ہوتی ہے، جس میں ڈھیر سارے حوالے ہوتے ہیں۔ حوالہ غلط ہو تو نمبر کاٹ لیے جاتے ہیں۔ یہ سب بکواس ہے۔ کہانیاں جمع کرنا بھی تحقیق ہے۔ آپ نے صرف اس شخص کا حوالہ دینا ہے، جس کی کہانی آپ نے جمع کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بہتر ہوگا آپ کہانیوں کے موضوعات منتخب کر لیں، جیسے .... جیسے مشرقی پاکستان کی علیحدگی، جیسے بم دھماکوں سے بچ جانے والوں کی کہانیاں، جیسے گھر میں کام کرنے والی عورتوں کی کہانیاں، جیسے زیادتی کے شکار بچوں اور عورتوں کی کہانیاں، جیسے گاؤں کے بوڑھوں کی زبانی سنی ہوئی کہانیاں، جیسے مزدور ں اور گھر میں سارا دن مکھیاں مارتی امیر عورتوں کی کہانیاں۔

ثمیرا نے پوچھا، سر یہ کہانیاں سچی ہونی چاہئیں؟ سر احمد نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا، دیکھو کہانی ہونی چاہیے، اور بس۔ سچ اور جھوٹ، کہانی کے لیے بے معنی ہے۔ رفیق نے میلان کنڈیرا کی کتاب 'ناول کا فن' کے حوالے سے ایک سوال کیا۔ سوال کیا تھا، اپنے علم کا مظاہرہ تھا۔ 'سر ، میلان کنڈیرا کہتے ہیں کہ ناول ہی ہمیں سائنس کی جارحیت سے بچا سکتا ہے، اور ہمیں اپنے وجود کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کر سکتا ہے'۔ سر احمد نے اونچا قہقہہ لگایا، اور بولے، مولانا آپ کیا کہتے ہیں؟ میں، میں ... سر یہ کہتا ہوں کہ کنڈیرا ٹھیک کہتے ہیں؟ سر احمد اس مرتبہ مسکرائے ، واہ مولانا، چیک ناول نگار کنڈیرا پر کتنا برا وقت آ گیا ہے کہ ایم فل اردو کی کلاس کا ایک نوجوان پاکستانی محقق یہ تصدیق کرے گا کہ کنڈیرا نے کیا غلط کہا اور کیا صحیح۔ سب ہنس پڑے۔ خیر، مولانا رفیق، بتاؤ تمھاری اپنی رائے کیا ہے؟ سر میری یہ رائے ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ فکشن پڑھنا چاہیے، تاکہ سائنس کی جارحیت سے بچ سکیں۔ سائنس کی جارحیت کی وضاحت کریں گے، مولانا؟ سر کی عادت تھی کہ کلاس میں ہونے والی کسی بات کی جب تک مکمل وضاحت نہ ہو جاتی، کوئی دوسری بات نہ شروع کرتے۔ رفیق نے کہا، سر سائنس کی جارحیت .... میرا مطلب ہے .... یہ ہے کہ اس نے ہمیں مذہب سے دور کر دیا ہے۔ سر نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: مولانا کبھی سنی سنائی باتوں کی دنیا سے نکل کر، دوسری طرف کی دنیا میں بھی چلے جایا کرو، سیر ہی سہی۔ اسی یونیورسٹی کے سائنس کے شعبوں کے استادوں اور طالب علموں سے

ملو، اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ لوگ سائنس پڑھتے ہیں، سائنس دان بھی کہلاتے ہیں مگر بالکل ایک عام ،نیم خواندہ شخص کی طرح کے مذہبی تصورات رکھتے ہیں۔ سائنس نے ان کا، اور ان کے مذہب کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ آپ کو سرن میں ہونے والے تجربات کے بارے میں بہت کچھ درست بتائیں گے، اصول لایقینیت پر زبردست لیکچر دیں گے، جینیاتی سائنس کے ہوش اڑا دینے والے حقائق سے پردہ اٹھائیں گے، کائنات کی لامحدودیت ولولہ خیز انداز میں بھی واضح کریں گے، لیکن کسی طالبہ کو کھلے سر دیکھیں گے تو اسے حجاب پر لمبا چوڑا لیکچر دیں گے، اور اسے گناہ گار ہونے کا یقین دلا کر رہیں گے، یا کسی دوسرے مذہب کے آدمی کی اپنے مذہب پر معمولی سی تنقید سنیں گے تو بھڑک اٹھیں گے اور بغیر تحقیق کے اس جلوس میں شامل ہو جائیں گے جو اس غریب کا گھر جلا رہا ہوتا ہے، خواہ بعد میں پتا چلے کہ اس بے چارے کے گھر کے پلاٹ پر قبضے کا منصوبہ تھا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے سر؟ میں نے اس مرتبہ پوچھا، دیکھو سائنس ایک چیز ہے، سائنسی فکر دوسری چیز ہے، اور سائنس پرستی تیسری چیز ہے، اور سائنسی ٹیکنالوجی چوتھی چیز ہے۔ کنڈیرا جس جارحیت کی بات کرتے ہیں، وہ آخری دو چیزوں سے متعلق ہے، اور ان دونوں کو حد میں رکھنے کی ضرورت ہے، اور اس میں فکشن اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ سائنس کے مفروضات کے حافظ بن جاتے ہیں یا ٹیکنالوجی کے ماہر، مگر سائنسی فکر انھیں چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ ان کا حال کچھ ایسا ہی ہے: 'مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا، جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا'۔ ایسے لوگوں کی جارحیت سے بھی ڈرنا چاہیے۔

میرا ذہن ابھی تک سر احمد کی اس بات میں الجھا تھا کہ سچ اور جھوٹ کہانی کے لیے بے معنی ہے۔ میں نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے، اور اسے خاموش ہو جانے کی درخواست کرتے ہوئے، سر احمد کو مخاطب کیا۔ سر سچ اور جھوٹ کسی بھی جگہ، خواہ وہ فکشن ہی کیوں نہ ہو، بے معنی کیسے ہو سکتا ہے؟ میری الجھن دور کیجیے، سر۔ میرے سوال کے جواب میں وہ تھوڑی دیر خاموش رہے، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر گویا ہوئے۔ میں ایک دن بازار سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا نئے جوتے خرید لوں۔ اچانک خیال آیا۔ بٹوے میں پیسے کم ہیں۔ سامنے ایک بینک کی اے ٹی ایم مشین نظر آئی۔ دروازہ کھولا،

وہاں...وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ ہم سب یہ سنتے ہی، بہ یک وقت خوف زدہ، پریشان اور متجسس ہوئے۔ سب نے بہ یک وقت کہا۔ سر پھر کیا ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ میں ....آپ بتائیں، میں نے کیا کیا ہوگا؟ انھوں نے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ آپ ڈر گئے ہوں گے، اور دروازہ بند کر کے پلٹ آئے ہوں گے۔ سر احمد نے میرے جواب پر تبصرہ کیے بغیر اروما سے وہی سوال کیا۔ سر، آپ نے ون فائیو پر فوراً کال کی ہوگی۔ رفیق نے کہا، سر آپ نے اردگرد لوگوں کو بتایا ہوگا تا کہ آپ کو قاتل نہ سمجھ لیا جائے۔ حمیرا نے کہا، سر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ لاش ہے، ہوسکتا ہے وہ زخمی ہو، اور بے ہوش ہو۔ سمیرا نے کہا، سر آپ کو اپنے حواس پر قابو پانے میں کچھ وقت لگا ہوگا، اور آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ اب کیا کیا جائے؟ مسعود، جو کم بولتا تھا، مگر اپنی بات پر سب کو چونکا دیتا تھا، اس نے کہا کہ سر آپ نے سوچا ہوگا کہ نئے جوتے اور لاش میں ضرور کوئی سرریئلی قسم کا تعلق ہے۔ میں نے ایک کہانی پڑھی تھی، جس میں ایک شخص اسی دن قتل ہو جاتا ہے، جس دن اس نے نئے جوتے پہنے تھے۔ سر احمد ڈائس پر ہاتھ رکھے اور ذرا سا آگے جھکے، سب کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے۔ اب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میاں یہ بتاؤ، ان میں سے کون سی بات درست ہے؟ میں سٹپٹا گیا۔ سر، یہ تو سب قیاس اور گمان ہیں۔ ایک بات کا اضافہ کرلو، یہ سب قیاس اور گمان کہانی سے متعلق ہیں۔ انھوں نے پوچھا، کیا یہ سب باتیں غلط ہیں؟ سر انھیں غلط کہنا مشکل ہے۔ کیا یہ سب سچ ہیں؟ نہیں سر، ایک ہی وقت میں یہ سب باتیں سچ کیوں کر ہوسکتی ہیں۔ میں سمجھ گیا، سر ہمیں کیا سمجھا رہے تھے۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ سر نے یہ کہانی وہیں کھڑے کھڑے گھڑی تھی۔ سر نے ہم سب سے پوچھا، کیا میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کسی کو یہ خیال آیا کہ میں نے یہ واقعہ گھڑا ہے۔ سب نے ناں میں جواب دیا۔ آپ سب کو اس لیے خیال نہیں آیا کہ یہ کہانی تھی۔ کہانی میں سچ جھوٹ کا چکر نہیں ہوتا۔ سمجھے۔

میں نے کہا، سر کم از کم میں پوری طرح نہیں سمجھا۔

گھامڑوں کو سامنے کی باتیں کہاں سمجھ آتی ہیں! اقرا نے چوٹ کی۔

تو کیا گھامڑوں کو سمجھنے کا حق نہیں؟ میں نے مسکراتے ہوئے احتجاج کیا۔

آپ لڑیں نہیں، میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ سر احمد نے مصالحت کراتے ہوئے کہا۔ آپ لوگوں

نے چند دن پہلے اخباروں میں اور سوشل میڈیا پر یہ خبر پڑھی اور دیکھی ہوگی کہ ماموں نے اپنی بیوی اور اس کے سگے بھانجے دونوں کو قتل کردیا۔

سر، ہم اخبار کم ہی پڑھتے ہیں، البتہ فیس بک سو فیصد لوگ استعمال کرتے ہیں۔ سب نے بہ یک آواز کہا۔

کسی کو یہ خبر یاد ہے؟ سر نے پوچھا۔

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سر، بات یہ ہے کہ فیس بک فلم کے فریم کی طرح ہے۔ ایک دفعہ جو فریم گزر جاتا ہے، دوبارہ نہیں آتا۔ اکرام، فیس بک کو بازار کہتا ہے، مگر میں قبرستان کہتا ہوں۔ یہاں چیزیں دفن ہونے کے لیے ظاہر ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔

خیر، ہم مطلب کی بات کرتے ہیں۔ سر، اپنے موضوع سے کبھی نہیں ہٹتے تھے۔ مجھے اس طرح کی خبریں بے حد اہم لگتی ہیں۔ یوں تو بے شمار لوگ روزانہ قتل ہوتے ہیں، مختلف اسباب سے، لیکن غیرت کے نام پر کیا گیا قتل، مجھے بے آبروئی کے شدید احساس میں مبتلا کرتا ہے۔ اس قسم کے قتل میں قتل کا سارا بھیانک پن، ساری دہشت، ساری بلاخیزی، ساری فساد پسندی، پوری سفاکی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ اس قسم کا قتل خود ہمیں شدید قسم کی بے بسی کا احساس دلاتا ہے، اور ہم اپنے اندر ایک ہیولے کے لیے غصہ، حقارت اور گھن محسوس کرتے ہیں۔ میں اس حالت سے نکلنے کے لیے اس طرح کے قتل سے متعلق ہر طرح کی تفصیل جمع کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، میں اس موضوع پر کبھی کتاب لکھوں۔

سر، قطع کلامی کی معذرت۔ ناول لکھیے گیا۔ میں تو ناول کے سوا کوئی کتاب پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اقبال نے کہا۔

وہ بھی کبھی مکمل نہیں پڑھا۔ میں نے طنز کیا، مگر یہ سچ تھا۔

اچھا ناول وہ ہے جو شروع، درمیان اور آخر کے چند صفحات پڑھنے سے پورا سمجھ آجائے۔ اقبال نے گویا تیر مارا۔

باقی صفحات میں ناول نگار جھک مارتے ہیں۔ اس مرتبہ حمیرا بولی۔

ٹھیک اسی وقت بجلی چلی گئی، اور کمرے میں اندھیرا ہوگیا، کچھ دیر کے لیے کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ اور اس کے ساتھ تھوڑی سی ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ نومبر کے شروع کے دن تھے۔ سر کی کلاس چار بجے ہوا کرتی تھی۔ دو تین منٹ بعد جنریٹر چلا، اور کمرہ روشن ہوگیا۔ کیا سچ اور جھوٹ اسی اندھیرے اور روشنی، خاموشی اور آواز کی طرح ہے، جس کا تجربہ ہم نے ابھی اس کمرے میں کیا ہے؟ میں نے سوچا۔ مگر مجھے لگا کہ یہ احمقانہ سوال ہے، اس لیے سر سے نہیں پوچھا، جب دونوں موجود ہیں تو دونوں سچ ہیں۔ جوں ہی کمرہ روشن ہوا تھا، سب بولنے لگے، جیسے اندھیرے میں خاموشی کا معمولی سا وقفہ ان کے لیے جاں لیوا تھا۔

سر نے سب کی طرف دیکھا، سب خاموش ہو گئے، اور اپنی بات جاری رکھی۔ غیرت کے نام پر قتل کی کہانی، قتل کی دوسری کہانیوں سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ میں نے غیرت کے نام پر قتل کرنے والوں کے جتنے حالات پڑھے ہیں، ان سے لگتا ہے کہ قتل کی سب صورتوں میں یہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے، اور اس کا محرک صرف غیرت نہیں، اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تاہم قاتلوں میں دو باتیں مشترک، میں نے دیکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے پاس فخر کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، لیکن شرمندہ ہونے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ ان کے ذہن پر ایک کہانی کی حکمرانی ہوتی ہے، اور وہ کہانی ہے ملکیت کی۔

سر، یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ میں نے گزارش کی۔

آدمی فخر اس چیز پر کرسکتا ہے، جسے اس نے ذاتی محنت اور لیاقت سے حاصل کیا ہو۔ فخر ایک ایسا احساس ہے، جسے انسانی انا اس وقت محسوس کرتی ہے، جب وہ اس یقین کی مالک ہوتی ہے کہ اس نے کوئی قلعہ فتح کرلیا ہے، اور کوئی اس کی فتح اس سے چھین نہیں سکتا۔ دوسری طرف غیرت کے نام پر قتل کرنے والے لوگ، ایک ایسی انا کے حامل ہوتے ہیں جو بغیر قلعہ فتح کیے فخر کرنا چاہتی ہے۔

سر، آپ کا مطلب ہے کہ یہ قاتل احساس کمتری اور کسی طرح کی شرمندگی کا شکار ہوتے ہیں۔ میں نے سمجھنے کی خاطر کہا۔

صرف احساس کمتری نہیں، حقیقی دنیا میں کوئی حقیقی کارنامہ نہ کرسکنے کے بحران کا شکار بھی

ہوتے ہیں۔ اگر صرف احساس کمتری ہو تو دوسروں کی کردار کشی پر اکتفا کی جاتی ہے، لیکن کوئی آدمی بحران میں مبتلا ہو، اور اسے سمجھ نہ پا رہا ہو، تو وہ ان سب کو قتل کر سکتا ہے، جنھیں وہ اس بحران کا ذمہ دار خیال کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ قاتل بزدل ہوتے ہیں۔ نہ تو اپنے بحران کا سامنا کر سکتے ہیں، اور نہ قتل کرنے کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کرتے ہیں، اکثر جائے وقوعہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسری جس بات کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، وہ بھی غیرت کے نام پر ہونے والے قتل کے سلسلے میں کافی اہم ہے۔

جی سر، ہمیں ضرور بتائیے۔ ہم سب نے کہا۔

غیرت کے نام پر قتل کرنے والا شخص، پیشہ ور قاتل سے مختلف ہوتا ہے، جو میکانکی انداز میں لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتا ہے۔ یہ قاتل ملکیت کی کہانی کے نیرنگ کے زیر اثر ہوتا ہے۔ وہ جسے قتل کرتا ہے، اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے، مگر اس طرح کی ملکیت نہیں، جس طرح کوئی مکان، گاڑی وغیرہ ہے۔ وہ قتل ہونے والے کے جسم اور اس کی شخصیت، اس کے امیج، اور ان سے وابستہ عزت و آبرو کے سماجی معیارات سب کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ قاتل کے ذہن میں، مقتول کی زندگی کا ایک ایک قدم ایک کہانی کی طرح گردش کر رہا ہوتا ہے، اور یہیں سے ایک جنگ شروع ہوتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جہاں بھی ملکیت اور حق ملکیت ہو، وہاں ایک قسم کی آقائی آدمی کے احساس کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ آقائیت، اسی طرح ایک سورمائی تصویر بن کر آدمی کے ذہن پر مسلط ہو جاتی ہے، جس طرح کسی کہانی کا ہیرو ساری کہانی پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ جسے غیرت کے نام پر قتل کیا جاتا ہے، یوں تو اس کا ہر آزادانہ قدم آقائیت کے لیے خطرہ ہوتا ہے، مگر جب وہ اپنی شخصیت یا جسم یا دونوں کو اسی طرح کسی کے حوالے کر دے، جس پر آقائیت صرف اور صرف اپنا مطلق حق سمجھتی ہے تو اسے قاتل بننے میں ایک پل نہیں لگتا۔

واہ، سر، واہ۔ ہم سب نے سر کے نفسیاتی تجزیے کی داد دی، لیکن سہم بھی گئے۔ سر نے معذرت کی کہ بات ذرا دوسری طرف چلی گئی، لیکن کہا کہ اس بات کا گہرا تعلق آگے کے کچھ واقعات سے ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کہانی کی ساری تفصیل اخبار اور پولیس

رپورٹ کی مدد سے جمع کی، جس کے مطابق ایک شوہر نے اپنی بیوی، اور اس کے بھانجے کو قتل کیا۔تم سب یہ تفصیل سنو گے تو تمھیں اس سوال کا جواب ملے گا کہ کہانی میں جھوٹ سچ کا چکر نہیں ہوتا۔ نہ تو اس کا جھوٹ خالص ہوتا ہے، نہ سچ۔ دونوں میں دونوں کی آمیزش ہوتی ہے، اور ایک ایسی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی جو یہ بتا سکے کہ یہاں جھوٹ کی سرحد ختم ہوتی ہے، اور سچ کی سرزمین کا آغاز ہوتا ہے، اور یہی کہانی کا طلسم ہے، اور یہی کہانی کا سب سے عظیم اسرار ہے۔ یہ اسرار جتنا عظیم ہے، اتنا ہی مقدس محسوس ہوتا ہے، اور اتنا ہی ہیبت ناک بھی۔ میں تمھیں وہ سب کہانی کے انداز میں سناتا ہوں، اور جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے، یہ سب تم اس کہانی کے ذریعے سمجھنے لگو گے۔

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔

شہلا گلی نمبر 7 کے پانچ گھروں میں کام کرتی تھی۔ ایک ایک گھنٹہ ہر گھر کی صفائی میں صرف کرتی تھی۔ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتی تو پچھلے گھر کی نئی تازہ خبریں بھی ساتھ لے جاتی۔ اگلے دن، دوسرے گھر کی خبریں پہلے گھر پہنچاتی۔ ہر گھر میں انعام کے طور پر اسے روزانہ چائے ملتی۔ اس گلی میں تیسرا گھر بہرام کا تھا، جس نے اسی شہر کے ایک بازار میں بجلی کے سامان کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہ صبح نو بجے جاتا تو رات نو بجے واپس آتا۔ اس کی بیوی ثمینہ، جو پینتیس سال کی ہوگی، اپنی دو بیٹیوں کو کالج، سکول بھیجنے کے بعد ٹی وی دیکھتی رہتی یا فون پر اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو لمبی کال کرتی۔ صبح نماز باقاعدگی سے پڑھنے کی بھی عادی تھی۔ بہرام، اس سے سات سال بڑا تھا، مگر دونوں کی عمریں برابر محسوس ہوتی تھیں۔ شہلا روزانہ ہی دوسرے گھروں کی کوئی نہ کوئی بات، ثمینہ کو سناتی جاتی اور صفائی بھی کرتی جاتی۔ زیادہ تر باتیں گھر کی چھوٹی موٹی لڑائیوں سے متعلق ہوتیں یا کپڑوں اور ان کے نئے نئے فیشن اور نئے نئے برانڈ سے متعلق ہوتیں۔ ایک دن ثمینہ نے کچھ حیرت اور چٹخارے کے انداز میں ایک نیا واقعہ سنایا۔ 'باجی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں رضیہ باجی کے کمرے میں یہ پوچھنے کے لیے چلی گئی کہ کچن کے فرش کی صفائی کے لیے فینائل کہاں پڑا ہے۔ توبہ، باجی، توبہ، میں نے دیکھا کہ رضیہ باجی بیڈ پر لیٹی ہے، اس کا دیور، پلنگ کے پاس کھڑا تھا، اس کی شلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ توبہ باجی، قیامت اب دور نہیں ہے۔' ثمینہ نے شہلا کو اپنے پاس بلالیا، جو فرش پر وائپر پھیر رہی تھی۔ مجھے

تفصیل سے بتاؤ، اسی دیور کے ساتھ، جس کی اگلے مہینے شادی ہے، اور جو اس کی بیٹی کی عمر کا ہے۔ 'ہاں، باجی، میں تمھیں کیسے بتاؤں، مجھے تو شرم آ رہی ہے، یہ کہتے ہوئے کہ رضیہ باجی نے جھوٹ موٹ سونے کا بہانہ بنایا، اور اوپر چادر ڈال لی'۔ لیکن، اپنے دیور کے ساتھ، وہ بھی اتنی چھوٹی عمر کے دیور کے ساتھ، کیسے، کیسے یہ سب ہوتا ہے؟ 'باجی، میں نے خود دیکھا ہے، باجی، ہر ایک کو اپنی قبر میں جانا ہے'۔ کیا تم نے پہلے بھی کبھی دیکھا، کبھی آپس میں ملتے ہوئے، میرا مطلب ہے، رضیہ کو اس کے ساتھ... ثمینہ کو غیر معمولی تجسس ہو رہا تھا۔ 'باجی، پہلے اس طرح تو نہیں دیکھا، مگر دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ میرے سامنے تھوڑی ایسا ویسا کریں گے، وہ تو میں اچانک گئی تو'۔ اچھا، تم ان پر نظر رکھنا اور مجھے بتاتے رہنا۔ بڑی نیک پروین بنی پھرتی ہے۔ اپنے خاوند کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ کبھی اسے پتا چل گیا تو؟ ثمینہ نے، شہلا کو چائے کے ساتھ آج بسکٹ دیتے ہوئے کہا۔ شہلا نے کہا 'باجی، اسے کیسے پتا چلے گا، وہ غریب صبح جاتا ہے، رات کو واپس آتا ہے'۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد ثمینہ کو بہرام نے بھانجے سمیت قتل کر دیا۔

سر، ان دونوں کہانیوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ میں نے پوچھا۔

شروع میں مجھے بھی یہ تعلق سمجھ نہیں آیا تھا، کافی دنوں بعد سمجھ آیا، جب میں نے اس پر تحقیق کی، اور خود بہرام اور شہلا سے بھی ملا، اور محلے کے کچھ لوگوں سے بھی۔ شہلا نے رضیہ اور اس کے دیور کی کہانی، ایک ایسے رازدارانہ انداز میں سنائی کہ اسے کہانی میں غیر معمولی دل چسپی پیدا ہوگئی۔ اب اس کا معمول بن گیا کہ وہ روز اس کہانی کی اگلی قسط کا اسی طرح انتظار کرتی، جس طرح اپنے پسندیدہ ٹی وی سیریل کی اگلی قسط کا انتظار کرتی تھی۔ شہلا نے بھی اپنے اندر ایک نئی طاقت دریافت کی تھی۔ کہانی بیان کرنے کی طاقت، جس سے اسے عزت، توجہ، اور گھر کی کئی چیزیں ملنی لگی تھیں۔ اس کہانی کا نقطۂ عروج وہ واقعہ تھا، جو دو ہفتے بعد شہلا نے بتایا۔ 'باجی، آج تو حد ہوگئی۔ آج دونوں..... باجی، آپ ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ بس یوں سمجھو، آپ بھائی بہرام کے ساتھ ایک بیڈ پر ہو، اور آپ کچھ دیر بعد نہانے جاتی ہو..... آج جب میں کام کے لیے گئی تو رضیہ باجی کے بال گیلے تھے، اور بڑی خوش تھی، جیسے کوئی خزانہ ملا ہو۔ لڑکا تھوڑی دیر بعد نہا کر نکلا۔ بھلا، ایسے ہی کوئی نہاتا ہے!' ثمینہ کے ماتھے پر پسینہ

تھا۔' باجی، میں جھوٹ نہیں بول رہی'۔تم جھوٹ کیوں بولوگی۔اس پھیکے کٹنی کو ایک لڑکے سے کیا ملتا ہے، جو اسے اس کا خاوند نہیں دے سکتا۔ برا زمانہ آگیا ہے۔رشتوں کا احترام ہی ختم ہوگیا ہے۔'ہاں، باجی، آپ ٹھیک کہتی ہو'۔

اس کہانی میں سب سے اہم کیا ہے؟ سر نے پوچھا۔

تزویج محرمات۔رفیق جھٹ سے بولا۔

اخلاقی زوال۔حمیرا نے کہا۔

کسی دیرینہ محرومی کی مروجہ اخلاقیات سے ہٹ کر تلافی کی سعی۔ میں نے اپنی طرف سے نکتہ طرازی کی۔

سر، دھوکا، بے وفائی، ظلم، گناہ۔اقرا نے رائے دی، اور لگا جیسے کانپ رہی ہے۔

یہ سب بھی ہے، لیکن ثمینہ کے لیے ان میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ یہ نکتہ نوٹ کرلو، ہر کہانی ہر شخص کے لیے ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ وہ بہ ظاہر توبہ توبہ کرتی تھی، اور اسے غلط سمجھ رہی تھی، مگر ساتھ ہی ایک نامعلوم راستے پر چلنے کا عزم بھی کر رہی تھی، اور اس راستے سے وابستہ احساس گناہ سے بچنے کی خاطر وہ رضیہ کو ملامت کر رہی تھی۔نشاط اور ندامت، ایک ساتھ اس پر یلغار کر رہے تھے۔اس طرح کی صورت حال اس کے تجربے کی دنیا سے یک سر باہر تھی' اس لیے وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔اس کے یہاں ڈر تو تھا مگر بے بسی کا احساس نہیں تھا اور اسی سے غضب ہوا۔وہ کہانی سنتے ہوئے لذت، سرخوشی' قبل از وقت پچھتاوے' ڈر جیسے متضاد جذبات کا تجربہ ایک ساتھ کر رہی تھی، لیکن ان سب پر یہ حقیقت حاوی ہوگئی تھی کہ اس نے اس کہانی کے ذریعے راز داری کی پرشوق دنیا کا ادراک کیا۔وہ اس سے پہلے واقف ہی نہیں تھی کہ انسانی وجود کا کوئی راز دارانہ منطقہ بھی ہوتا ہے، اور اس کی طرف آدمی اسی طرح کھنچا چلا جاتا ہے، جس طرح کوہِ ندا کی طرف۔ثمینہ واقعی ایک شریف عورت تھی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی تھی، اور شادی سے پہلے یا بعد میں اس کا کوئی چکر کسی کے ساتھ نہیں رہا تھا۔شادی کے ایک سال بعد پہلی بیٹی پیدا ہوئی تھی، پھر اگلے سال دوسری۔وہ بے حد مصروف ہوگئی تھی ۔لیکن پینتیس سال کی عمر کو پہنچ کر اس کے پاس کافی فرصت تھی۔ یاد رکھو، ہر شخص محبت ہی کے ذریعے، انسانی

وجود کا راز دارانہ گوشہ دریافت کرتا ہے۔ محبت میں چھپ کر ملنا، صرف خوف کی وجہ سے نہیں ہوتا، اپنے وجود کے راز ادارانہ منطقے کو راز ہی میں رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ چوں کہ ثمینہ کے لیے یہ ایک عظیم دریافت تھی، جس سے وہ پہلے لاعلم تھی، لیکن خود اسے معلوم نہیں تھا کہ عظیم دریافت کو سنبھالنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ دنیا میں تقریباً ہر شخص کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جو اسے دیوتا بننے کا موقع دیتا ہے، مگر اکثر لوگ یہ موقع ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسے اکثر لکھنے والے چار جملے زبردست لکھتے ہیں، اس کے بعد زبردستی لکھتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ وہ ادیب ہیں، جنھوں نے دیوتا بننے کا موقع ضائع کیا ہوتا ہے۔ ثمینہ کے گھر میں اس کی بڑی بہن کا بیٹا، جو اس کی بڑی بیٹی سے چار سال بڑا تھا، اکثر آتا تھا، اور دونوں بہنوں کا خیال تھا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے میں دل چسپی لے رہے ہیں۔

یعنی راز داری کی دنیا دریافت کر رہے ہیں۔ میں نے گرہ لگائی۔

لیکن سر، آدمی دیوتا کیسے بن سکتا ہے؟ کیا یہ صرف شاعرانہ نکتہ ہے؟ حمیرا نے پوچھا۔

نہیں، یہ حقیقت ہے۔ صرف محبت اور موت ہی آدمی کو دیوتا بننے کا موقع دیتے ہیں۔ مت بھولو کہ یہ موقع دیتی ہیں، بناتی نہیں، بننا آدمی نے خود ہے۔ محبت آدمی کے دل میں ایک چشمہ جاری کرتی ہے، جس میں سے لازوال وابستگی، اتحاد، یگانگت، بے لوثی، وفاداری، اور ان سے آگے جا کر ایثار، اخلاص، اطاعت و پرستش جیسے جذبات کے دھارے بہتے ہیں، اور ایک اچرج، البیلی، نادر، ملکوتی قسم کی غنائیت آدمی کے اندر بھر جاتی ہے، جو آدمی کو دو عالم سے بے نیاز کرنے کا امکان رکھتی ہے۔ اگر آدمی اس غنائیت کو اپنی روح کے ازلی وقدیمی سکوت سے جوڑ دے، اور اسے کسی دوسرے پر اندھا دھند صرف کرنے سے گریز کرے تو وہ دیوتا بن سکتا ہے، اپنے اندر اس حقیقی الوہی احساس کو پیدا کر سکتا ہے، جو دنیا کی ہر شے سے بہ یک وقت وابستہ اور بے تعلق ہونے کی رمز سے آگاہ کرتا ہے۔

سر پلیز، محبت کو اتنا مشکل تو نہ بنائیں۔ اقرا نے درخواست کی۔

میڈم، محبت غالب کی شاعری، اور پہاڑی چشمے کی طرح ہوتی ہی مشکل پسند ہے۔ سر نے ذرا ساڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ لوگ دیوتا بننے سے ڈرتے ہیں، اس لیے محبت کو ایک عیاش امیرزادے کی طرح بے دریغ اور بے محل صَرف کر ڈالتے ہیں، اور موت کے صدمے کو جیسے تیسے جلد نپٹا

دیتے ہیں۔

ثمینہ کی کہانی تو بیچ میں رہ گئی۔ میں نے عرض کیا۔

سر مسکرائے ، یہ سب اسی کہانی کا حصہ ہے۔ ثمینہ نے خالصتاً اپنی جبلت پر انحصار کرتے ہوئے ، اپنے بھانجے کو رجھانا شروع کیا۔ اسی دوران میں اس نے دریافت کیا کہ عورت کے پاس دو بڑے خزانے ہیں، اس کا جسم ،اور اظہار۔ اس نے دونوں پر توجہ دینا شروع کی۔ اسے اچانک اپنے بڑھتے پیٹ کا احساس ہوا،اور لباس کے سلسلے میں بے پروائی کا،اور بات کرنے اور مسکرانے کے حوالے سے بھونڈے پن کا۔ اس نے فوراً کھانا کم کر دیا،اور شوہر سے نئے برانڈ کے کپڑوں کی فرمائش شروع کر دی۔ کپڑوں کے وہی رنگ پہننے شروع کر دیے جو اس کی بڑی بیٹی پہنتی تھی۔ سب سے انتہائی شائستہ انداز میں بات چیت کرنے لگی۔ شوہر اور بیٹیوں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا، مگر پسندیدگی کا اظہار کیا کہ چلیں اسے خود پر دھیان دینے کا خیال تو آیا۔ ایک تبدیلی صرف اس کے بھانجے شہریار نے محسوس کی کہ اس کی آواز باریک ہوگئی تھی ،اور اس نے باقاعدہ شرما کے بات کرنا شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد وہی ہوا، جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ جب مرد کو عزت، پیسہ، حد سے بڑھا ہوا پروٹوکول، محبت جنس سب آسانی سے اور ایک جگہ دستیاب ہو تو وہ کسی عمر کا ہو، فوراً قبول کر لیتا ہے۔ دونوں کی کہانی راز داری کی کہانی تھی، مگر ثمینہ کی بڑی بیٹی، اب اس کی رقیب تھی، اسے شہریار کے رویے کی تبدیلی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے باپ کو سب بتا دیا، اور پھر وہی ہوا، جس کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔

لیکن سر، آپ نے تو ہمیں کہانی کے جھوٹ سچ سے متعلق بتانا تھا۔ میں نے عرض کی۔

اسی پہ آ رہا ہوں۔ سر نے برا نہیں مانا، اور اپنی بات جاری رکھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رضیہ اور اس کے دیور میں کوئی ایسا تعلق نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس کا دیور اس کے کمرے میں، جہاں وہ واقعی سو رہی تھی، اپنی شلوار تبدیل کر رہا تھا۔ اسی واقعے سے ساری کہانی کا تانا بانا بنا گیا تھا۔ رضیہ اور اس کے دیور کی ساری کہانی کچھ اتفاقات کی تاویل سے گھڑی گئی تھی۔ گویا وہ ایک جھوٹ تھا، جس کی مدد سے ایک سچی کہانی نے جنم لیا۔ ثمینہ نے ایک کہانی کا حقیقی مثل اپنی جان پر کھیل کر تیار کیا۔ ثمینہ کے لیے وہ ایک ایسی کہانی تھی ، جس میں حقیقی ترغیب موجود تھی۔ شہلا نے اسے اس انداز میں بیان کیا کہ اس

کے سچ یا جھوٹ ہونے کا سوال، کہانی سے سرے سے غائب ہو گیا۔ شہلا پر کچھ تو لالچ کا اثر تھا، کچھ نئی قسم کی ملنے والی عزت اور توجہ کا اثر تھا، مگر زیادہ تر وہ کہانی کے طلسم کے زیر اثر تھی۔ وہ اسی طرح کہانی بیان کر رہی تھی، جس طرح یونانی دیویوں کے زیر اثر شاعری لکھتے تھے، یا عرب جنوں کے زیر اثر اشعار کہا کرتے تھے۔ اس پر کہانی کا آسیب طاری تھا۔ سر ایک خاص سرشاری کی کیفیت میں بیان کرتے چلے جا رہے تھے۔

سر، یہ تو واضح ہو گیا کہ جب ہم کہانی سنتے یا پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ....؟ میں نے ایک طرح سے مداخلت کی۔ سر نے پہلی مرتبہ مجھے ٹوکا۔

سنو، میاں، ساری گڑبڑ بھی یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ کہانی کا سب سے بڑا طلسم یہ ہے کہ وہ تجسس کو تحریک دیتی ہے، مگر تشکیک کا راستہ بند کر دیتی ہے۔ آپ لوگ تنقید پڑھتے ہیں تو آپ کے ذہن میں تشکیک پیدا ہوتی ہے۔ نئے سوال جنم لیتے ہیں، مگر کہانیوں میں آپ ہر لمحہ یہ جاننے کے مشتاق رہتے ہیں کہ آگے کیا ہوا؟ یہ تجسس، کہانی کی ٹھیک ٹھیک نقل کرنے کی سب سے بڑی ترغیب بنتا ہے۔ ثمینہ بھی شہلا سے روزانہ یہی سوال کرتی تھی کہ آگے کیا ہوا؟ جب تک اس نے کہانی کا عروج واقعہ نہیں سن لیا، اس کا تجسس برقرار رہا، پھر یہی تجسس اسے اسی طرح کی کہانی خود اپنے خون سے لکھنے کا محرک بنا۔ ہماری زندگیاں کہانیوں کی ٹھیک ٹھیک نقل کی کوششوں کے سوا کچھ نہیں۔ نقل کی ان کوششوں میں ہمیں اکثر ٹھوکریں اس لیے لگتی ہیں کہ ہم کہانی سنتے پڑھتے ہوئے، یہ سوال نہیں اٹھا پاتے کہ جو ہوا، یہی ہو سکتا تھا یا کوئی اور امکان بھی تھا؟ یہ جاننا آسان نہیں کہ کہانی ہمیں اس سوال کی مہلت نہیں دیتی، یا ہم پر کہانی کا تجسس و ترغیب اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ ہم یہ سوال نہیں اٹھا پاتے۔ بہ ہر حال یہ کہانی کا طلسم ہے، اور بڑا ہی خطرناک۔ کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اب تک کہانیوں نے جتنی زندگیوں کے چراغ گل کیے ہیں، کاش اس پر کوئی تحقیق کرے! کل اور آج کی تمام بڑی جنگوں کے پیچھے کچھ کہانیوں ہی کا ہاتھ ہے۔ ہیلن سے لے کر صلیبی جنگوں، مہابھارت سے 1857ء کی آزادی کی جنگ تک اور اب نائن الیون کے بعد کی جنگیں۔

جی سر، محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ میں نے کہا، لیکن سر کہانی

جنگ، ہوس، نفرت سے نجات بھی تو دلا سکتی ہے؟

بالکل، اس کی سب سے بڑی مثال شہرزاد کی ہے۔ سر نے کہا۔

لیکن سر، اگر کہانی واقعی ایک طلسم ہے تو سب سے زیادہ احتیاط تو کہانی کہنے والے پر فرض ہے۔ حمیرا نے پوچھا۔

آپ کا مطلب ہے، صرف سچی کہانیاں لکھی جائیں۔ میں نے کہا۔

پوری رات قصہ ہوتا رہا، صبح پوچھا، ہیر عورت تھی یا مرد۔ سر نے پورا لیکچر اس پر صَرف کر دیا کہ کہانی میں جھوٹ سچ میں لکیر موجود ہی نہیں ہوتی، اور تم کہہ رہے ہو کہ سچی کہانیاں لکھی جائیں۔

میں شرمندہ ہوا، اور مدد کے لیے سر کی طرف دیکھا۔

دیکھو بھئی، کہانی کسی سچے واقعے پر مبنی ہے، یا فرضی واقعے پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب واقعات کہانی بن جاتے ہیں تو ان میں سچ اور جھوٹ مسئلہ نہیں رہتے۔ ایک طلسم تیار ہو جاتا ہے، اس نے اثر کرنا ہی کرنا ہے۔ لیکن اب آخری چند باتیں غور سے سنو۔ باریک باتوں سے تم سب کو نیند آنے لگتی ہے۔

لیکن سر، کہانی سے تو نیند جاتی رہتی ہے۔ میں نے شرارت کی۔

ہاں، کہانیاں ہماری نیندیں اڑانے کی صلاحیت رکھتی ہیں، یہی آخری باتوں میں سے ایک بات ہے۔ کہانی طلسم کے ساتھ ساتھ، ہمارے وجود اور ہماری انسانی بقا کا اہم ترین مسئلہ بھی ہے۔ سچ اور عظمت، ہماری ہستی کی بلند ترین آرزوئیں ہیں۔ کہانی میں سچ اور جھوٹ کا امتیاز باقی نہیں رہتا، لیکن ہمیں سچ چاہیے۔ ثمینہ نے بھی اپنے وجود کا سچ کہانی کے ذریعے دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا المیہ یہ تھا کہ اس نے وجود کی رازداری میں، جسے محبت ہی سے دریافت کیا جاتا ہے، ایک دوسرے شخص کو بھونڈے طریقے سے شریک کیا۔ اس نے اپنے وجود کی ایک عظیم ترین سچائی کو دریافت کیا، مگر اسے سنبھال نہ سکی۔ ایک عظیم دولت ہاتھ میں آئی، جسے اس نے بے دریغ اور بے محل لٹا دیا۔

سر، آپ کا مطلب ہے کہ اس کا شوہر ذمہ دار نہیں جس نے غیرت کے نام پر قتل کیا، یا جس نے اسے نظر انداز کیے رکھا۔ آپ کا نقطۂ نظر تانیثیت مخالف محسوس ہوتا ہے۔ میں واقعی الجھ گیا تھا۔

شوہر نے ظلم کیا، اس میں دو رائے نہیں۔ شوہر کے پاس طلاق کا راستہ تھا، اس نے یہ راستہ اختیار کرنے کے بجائے، اپنے احساس کمتری، بحران، اور اپنی آقائیت کے غیر مصالحت پسند جذبے کے زیر اثر دونوں کو قتل کر ڈالا۔ بجلی کا سامان بیچنا، روٹی روزی تو کمانا ہے، لیکن اس سے انسانی انا فخر تو محسوس نہیں کر سکتی۔ روٹین کی زندگی اسی لیے، ہم سب کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ اگر ہم اس سے نکلنے کا ایک ایسا راستہ نکال نہ سکیں، جو روٹین کے جبر سے ہمیں آزاد کرے تو ہم لاکھ روشن خیالی کے قصیدے پڑھیں، ہمیں متشدد ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

سر اسی لیے میں روٹین کے نصاب سے ہٹ کر ضرور کوئی کتاب پڑھتا ہوں۔ رفیق خوش ہو کر بولا۔

لیکن میں کہتا ہوں اگر کتابیں پڑھنا بھی روٹین بن جائے تو اس روٹین سے نکلنے کا راستہ بنانا چاہیے۔ سر نے کہا۔

وہ کیا ہو سکتا ہے؟ اروما نے پوچھا۔

کوئی بھی، سیر، مراقبہ، اکیلے بیٹھ کر شام کو کافی پینا، کسی دوست کے ساتھ گپ شپ، یونیورسٹی سے ایک دن کی چھٹی۔ سر نے کہا، اور پھر واپس اپنے موضوع کی طرف آئے۔ میں ثمینہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس نے ایک کہانی کے ترغیب آمیز بیان کی مدد سے اپنے وجود کی عظیم ترین سچائی تو دریافت کر لی، مگر یہ سچائی آگے بڑھنے کا مطالبہ کرتی تھی، اسے ثمینہ نہیں سمجھی، اور وہ پیچھے، یعنی عمر گزشتہ کی طرف لوٹنے کی غلطی کر بیٹھی۔ اسے محبت جس مرحلے پر نصیب ہوئی، وہاں محبت نے خود کو دکھ، فراق، نارسائی اور ایک مسلسل درد کی صورت ظاہر کیا، لیکن اس نے ایک آسان، ٹیڑھا، نیچے کی طرف لڑھکنے والا راستہ اختیار کیا۔

سر، یہ فلسفہ ہمارے پلے بالکل نہیں پڑا۔ ہم سب اکٹھے بول پڑے۔

یہ کوئی فلسفہ نہیں، روزمرہ کی ایک حقیقت ہے۔ ہم سب کہانیوں کی مدد سے روزانہ اپنے اپنے وجود کی سچائیوں سے آگاہ ہوتے ہیں، ایسی سچائیاں جو ہمیں روزمرہ کی دنیا سے کچھ دیر کے لیے نکال لیتی ہیں۔ روزمرہ کی دنیا سے نکل کر ہم اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جسے آپ چاہیں تو سری دنیا کہیں،

چاہیں تو لاشعوری نفسی دنیا کہیں، چاہیں تو ماورائے مادی دنیا کہیں۔ ایک بات واضح ہے، کہانی ہمیں اس دنیا میں لے جاتی ہے، جس سے ہمارا تعارف خوابوں میں ہوتا ہے، یا بعض خلاف معمول تجربات میں یا محبت میں۔ کہانی ہمیں ہمارے وجود کی سچائی سے آگاہ کرتی ہے، مگر ایک کام ہمیں کرنا ہوتا ہے، اور وہ ہے، اپنی سچائی کا بوجھ اٹھانا اور اپنی سچائی کو قابل پرسش سمجھنا۔

سر، اتنی فلسفیانہ باتوں کا بوجھ ہم اردو کے طالب علم نہیں اٹھا پاتے۔ میں گڑ گڑایا۔

سر مسکرائے، اور کہا، ایک سادہ مثال سے سمجھاتا ہوں۔ آپ گلاب کا ایک پھول توڑتے ہیں، یہ روزمرہ کا واقعہ ہے۔ اس کا کیا کریں گے؟ ہم میں سے کچھ لوگ بولنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ سر نے کہا، مجھے اب بات مکمل کرنے دو۔ کیا آپ یہ پھول کسی کو دیں گے؟ کیا اسے اپنے کوٹ میں اڑس لیں گے؟ کیا اسے کتاب میں رکھیں گے؟ یا اسے یوں ہی راستے میں پھینک دیں گے؟ آپ لازماً ان میں سے کوئی ایک عمل اختیار کریں گے۔ اب ذرا سوچیے، ذرا سا تو سوچ لیں گے نا! (ہم سب جھینپ گئے اور کھسیانی ہنسی ہنسے)۔ آپ نے پھول کو اس کی روزمرہ کی دنیا سے نکالا، اور اس دنیا میں لے آئے جس میں پھول کو اپنی بقا کا سوال درپیش ہے، لیکن اس کے ساتھ خود آپ پر یہ پھول ایک بوجھ ہے، اور آپ پھول توڑنے اور اس کا کچھ نہ کچھ کرنے کے سلسلے میں قابل پرسش ہیں۔ آپ پھول کو اگر راستے میں بھی پھینک دیں تو خود کو قابل پرسش ہونے کی حالت سے نہیں نکال سکتے۔ سمجھے؟ (ہم سب ہمہ تن گوش تھے، اتنا وقت گزرنے کے باوجود)۔ دیکھیے ایک بہ ظاہر معمولی سے واقعے نے آپ کو انتہائی غیر معمولی صورتِ حال میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہی کچھ کہانی کے عام سے، معمولی واقعات سے ہوتا ہے، جو ہمیں ہمارے وجود کے غیر معمولی منطقوں میں لے جاتے ہیں۔ کہانی کے ذریعے آپ اپنی ہستی کے جس سچ سے واقف ہوتے ہیں، وہ اس پھول کی طرح ہے۔ آپ نے لازماً کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ کیا آپ اسے یوں ہی راستے میں لاپروائی سے پھینک دیں گے، یا کچھ اور کریں گے؟ آپ کو ایک عام سی شے، عام سی روزمرہ کی حقیقت، ایک بڑا فیصلہ کرنے کی حالت میں پہنچا دیتی ہے۔ آپ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے کی اس حالت سے نکال دیتی ہے، جس میں آپ بعض اوقات دہائیوں تک مبتلا رہتے ہیں۔ جی ہاں ایک کہانی، اس کا کوئی کردار، اس کا کوئی واقعہ، اس کا کوئی ایک

حملہ، آپ کو اپنی ہستی کے غیر معمولی پن کے روبرو لاتا ہے، اور آپ خود کو ایک قدم اٹھانے، اور ایک فیصلہ کرنے پر مجبور پاتے ہیں۔

سر، کیا اپنی ہستی سے متعلق فیصلہ اخلاقی ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر فکشن، بلکہ سارا ادب ہمیں جس انسان سے آگاہ کرتا ہے، وہ ایک اخلاقی انسان ہے؟ رفیق نے اپنی حیات طالب علمی کا بہترین سوال کیا۔

دیکھیں، یہ معاملہ بہت پیچیدہ اور گہرا ہے۔ آپ جب کنویں میں جھانکتے ہیں تو کیا نظر آتا ہے؟ اندھیرا، لیکن وہاں گہرائی ہے، پانی ہے، پاتال تک جانے کا ممکنہ راستہ ہے۔ ہمارے اندر بھی کنواں ہے۔ وہ جتنا دکھائی دیتا ہے' اس سے زیادہ ہے۔ (بعض تو ساری عمر لاعلم رہتے ہیں کہ ان کے اندر بھی کنواں تھا) یہ فیصلہ بھی آپ نے کرنا ہے کہ آپ اس کنویں یا سرچشمے کے پرانے نام کو قبول کریں گے یا اسے نیا نام دیں گے، اور اس کے پانی سے کیا کام لیں گے؟ آپ اپنی ہستی کے سچ کے سلسلے میں ایک اخلاقی فیصلہ کریں گے، یا نفسیاتی، یا روحانی یا جمالیاتی؟ یہ سارے فیصلے ممکن ہیں۔

لیکن سر، ہمیں کیسے پتا چلے گا ہمارا کون سا فیصلہ درست ہے؟ میں نے پوچھا۔

تم امتحان سے پہلے نتیجہ چاہتے ہو۔ جب تم اندر کے کنویں میں اترو گے تو اس سے متعلق فیصلے کا راستہ بھی وہیں دریافت کر لو گے۔ اکثر کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی تاریکی کو دوسروں کی دریافت کردہ روشنی سے دور کرنا چاہتے ہیں' حالاں کہ ان کی اپنی روشنی' انھی کی تاریکی میں مضمر ہوتی ہے۔ اپنی تاریکی کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرو' اپنی تاریکی کی گھنی سیاہی کے اندر اترو گے تو دیکھو گے کہ تاریکی لَو دینے لگی ہے۔ تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے کہ تمھیں اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلوں تک پہنچانے والا راستہ' تمھارے اپنے وجود کی ہولناک تاریکی سے پھوٹتا اور روشن ہوتا ہے۔ اپنی اپنی تاریکی کو ایک مقدس حقیقت سمجھ کر اس کا احترام کرنا سیکھو۔ دوسروں سے روشنی کی بھیک مت مانگو۔

ہم سب پر سحر طاری تھا!

اب آیئے کہانی کی طرف۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ کہانی کے سچ تک صرف پہنچیں گے۔ جیسے کہ ثمینہ پہنچی، یا اسے سمجھیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے، یعنی اس کے قابل پرسش ہونے کو بھی قبول کریں گے۔ اس کا ایک آسان راستہ ہے۔ ہر کہانی ایک ایسا سچ ہے، جس میں دہرائے

جانے، بار بار دہرائے جانے اور تبدیلی کی مسلسل گنجائش ہے۔آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی، جنھیں دنیا کے مختلف ملکوں کے ادیبوں نے بدل بدل کر لکھا ہے۔

سر، قطع کلامی کی معذرت۔ جیسے انتظار حسین کا افسانہ 'نرناری' اور ٹامس مان کا ناول Transposed Heads 'بیتال پچیسی' کی کہانی پر مبنی ہیں۔ میں نے علمیت جھاڑی۔ رفیق کہاں رکنے والا تھا۔ بولا۔ جیسے سر پریم چند کے افسانے کا ہوری اور سریندر پرکاش کے 'بجوکا' میں۔حمیرا نے بھی حصہ ڈالا، جیسے شیکسپیئر کا ڈراما 'کنگ لیئر' اور 'باغ و بہار' میں بصرے کی ملکہ کا قصہ۔

ہاں، ہاں، سر اپنی بات جلدی جلد مکمل کرنا چاہتے تھے۔آج ان کا لیکچر کافی طویل ہو گیا تھا، اور انھوں نے کلاس ہی میں سر سلیم کو فون کر کے گزارش کی تھی کہ آدھ گھنٹے بعد تشریف لائیں۔انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔اس سے بھی پیچھے جائیں تو آپ کو ایک کہانی کو سو طرح سے لکھنے کی روایت ملے گی۔ پنچ تنتر کی کہانیاں عربی سے ہوتی ہوئیں، فارسی کی انوار سہیلی سے ہوتی ہوئی واپس ہندوستان پہنچتی ہیں، اور کیا کیا سے بن چکی ہوتی ہیں۔ایک طرف کہانیوں کے پروٹو ٹائپ یعنی بنیادی کہانیاں ہیں؛ جن کی وجہ سے مختلف خطوں کے لوگ ایک جیسی کہانیاں لکھتے ہیں اور عالم فاضل لوگ چونک جاتے ہیں کہ ایک عظیم طوفان کی کہانی' گل گامش کی کہانی میں؛ وشنو کے مچھلی بن کر منو کو عظیم سیلاب سے خبردار کرنے کی کہانی میں اور سامی مذاہب کی مقدس کتابوں میں طوفان نوح کی کہانی میں کیسے نظر آتی ہے؟ دوسری طرف کہانی کے ذریعے دنیا کو سمجھنے اور برتنے کا طریقہ ہے؛ جو عقلی طریقے سے مختلف ہے اور ہم سب میں ''بائی ڈیفالٹ'' موجود ہے۔عقل رکھنے کے باوجود ہم کم سے کم عقل کے ذریعے چیزوں کو سمجھتے ہیں' مگر کہانی کے طریقے سے' ہر وقت چیزوں کو سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ بہر حال' کہانی کے سچ میں دہرائے جانے کی خلقی صلاحیت ہے۔ یہ وہ مطلق سچ نہیں ہے جو ہر حال میں ہر جگہ ہر ایک کے لیے یکساں ہوتا ہے۔اب آخری بات توجہ سے سنو۔کہانی پڑھتے ہوئے، ہمیں بھی کہانی کے سچ کو دہرانا چاہیے۔ جو کردار ہمیں زیادہ دل چسپ لگے، اس کی زندگی کے سچ کو نئے سرے سے ترتیب دینا چاہیے، اس کے سامنے عمل کے جو سارے امکانات تھے، ان کا جائزہ لینا چاہیے، اور ہر ایک عمل کے ممکنہ اثرات کو دیکھنا چاہیے اور اس کردار کے سچ سے ہمیں یہ

بات دریافت کرنی چاہیے کہ کیسے وہ سچ اپنے اندر عظمت رکھتا ہے، اور اپنی حفاظت کا کیا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کردار نے کہاں تک سچ کو پہچانا، اور کہاں تک نہیں پہچانا، اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا یا نہیں۔ گویا تجسس کے ساتھ ذرا سی تشکیک کو شامل کرنا چاہیے۔ 'آگے کیا ہوا' کے ساتھ ساتھ 'کیا یہی ہونا چاہیے تھا؟ کیا صرف یہی ممکن تھا؟ کیا یہی ناگزیر تھا؟' کیا دنیا میں واقعی کچھ ناگزیر ہوتا ہے' یا صرف امکانات ہیں؟ جیسے سوالوں پر بھی غور کرنا چاہیے۔

سر، اس طرح تو تفریحی، جاسوسی فکشن کی تو کوئی جگہ نہیں، اور جو لوگ محض لذت کے لیے پڑھتے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ رفیق نے کہا۔

سر، کیا یہ اس کردار کی زندگی میں ہماری مداخلت نہیں؟ ہم کون ہوتے ہیں کسی کردار کے عمل پر سوال اٹھانے والے؟ میں نے سوال کیا۔

کیا یہ سوالات تقدیر سے انکار نہیں ہوں گے؟ حمیرا نے پوچھا۔

سر، کیا کردار کے عمل کا ذمہ دار مصنف نہیں؟ عمران پہلی مرتبہ گویا ہوا۔

سر، عمیرہ احمد کو پڑھنے والیوں کے پاس وقت ہوگا کہ وہ دوسروں کے مذہب تبدیل کراتے کرداروں کے عمل کا جائزہ لے سکیں؟ رفیق نے اروما اور حمیرا وغیرہ پر وار کیا۔

سر نے سب کی باتیں سنیں، اور اسی رو میں اپنی بات جاری رکھی۔ دیکھو، کردار اور آدمی میں فرق ہے۔ آدمی کی زندگی نجی ہے، جیسے مولانا رفیق کی، جیسے میری اپنی، اس میں مداخلت کا حق ہم میں سے کسی کو نہیں، مگر کردار کی زندگی کھلی کتاب ہے، جس کو جاننے اور جس پر گفتگو کا حق ہر ایک کو ہے۔ یہ حق لوگوں کو خود کردار دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے جانا جائے، کردار کی نجی زندگی ہوتی ہے مگر وہ اسے عوامی بناتا ہے، یا یوں کہہ لیں، کردار یہ واضح کرتا ہے کہ نجی اور عوامی زندگی اسی طرح ایک دوسرے سے آمیز ہیں، جیسے کہانی کا جھوٹ سچ۔ کردار چاہتا ہے کہ اس کی شہرت ہو، اور اس کا ذکر ہو، اور اس سے وابستہ ہر واقعے کو پڑھا، سنا جائے۔ پھر ہر کردار ہماری ذاتی زندگی میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لیے بھی، اس کے ہر عمل پر غور کرنا ضروری ہے۔ جو لفظ، جو تصور، جو تصویر آپ کے اندر کی تنہائی میں پہنچتی ہے، اسے نظرانداز کرنے کا مطلب ایسے ہی ہے، جیسے آپ یہ نہ دیکھیں کہ جس راستے پر آپ

چل رہے ہیں، اس پر کانٹے ہیں یا پتھر یا وہ ہموار ہے۔ اس کا نتیجہ معلوم ہے؟ ہر مصنف، کہانی لکھتے ہوئے، خدا کے منصب پر ہوتا ہے، جیسا چاہتا ہے، کردار بناتا ہے، اور اس کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے۔ خدا ہونا ایک بات ہے، خدا کا منصب اختیار کرنا دوسری بات ہے۔ خدا کا منصب، خدا کے حقیقی اختیار کے بارے میں قائم کیے گئے انسانی تصور کی نقل ہے۔ نقل میں اصل کے قریب رہنے کی کوشش سے بڑے بڑے گھپلے ہوتے ہیں۔ کہانیوں میں بھی اصل سے قریب رہنے کی کوشش میں بڑے بڑے گھپلے ہوتے ہیں، اور کہانیوں کی اصل کے قریب رہنے کی کوشش میں جب ہم ان کی نقل کرتے ہیں تو اس سے بھی بڑے بڑے گھپلے ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال مصنف، خدا کی طرح کسی کو جواب دہ نہیں سمجھتا، مگر اس کی تخلیق سمجھے جانے، دہرائے جانے، حقیقی طور پر یا تخیلی طور پر، یا کسی متن کے ذریعے دہرائے جانے کا تقاضا کرتی ہے، اور اس پر مصنف کا اختیار نہیں۔ لیکن، جیسا آپ نے دیکھا، شہلا سے زیادہ اس کی سنائی گئی کہانی اہم ثابت ہوئی تھی، جس کی نقل ثمینہ نے، اس کے امکانات کو سمجھے بغیر کی، اور کتنا بڑا گھپلا ہوا، وہ ہم پہلے ہی جان چکے ہیں۔

سر، بے حد معذرت کے ساتھ، فقط آخری بات کا جواب دے دیجیے۔ میں نے درخواست کی۔ اگر ثمینہ یہ کہانی نہ سنتی تو کیا اپنے انجام سے بچ سکتی تھی؟ اگر ایسا ہے تو کہانیوں کے پڑھنے اور سننے کے سلسلے میں ہمیں بے حد احتیاط چاہیے۔

سر کافی تھک گئے تھے، مگر وہ کسی طالب علم کے سوال کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ آپ نے سنا ہوگا، کچھ تصویریں اصل سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہیں، یہ بھی سنا ہوگا کچھ لوگوں کے میڈیائی امیج ، ان کی حقیقی زندگی سے کہیں زیادہ خوب صورت اور طاقت ور ہوتے ہیں۔ تصویر، کہانی اور امیج کے قہر سے بچنے کی کوشش ہر وقت چاہیے۔ ہر کہانی کو پڑھتے ہوئے 'اگر' کو سب سے زیادہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر ثمینہ، شہلا سے کہانی نہ سنتی تو بھی اس نے اپنے وجود کے رازدارانہ گوشے سے بالآخر آگاہ ہونا تھا، اور کسی کہانی کے ذریعے ہی۔ وہ کسی ٹی وی سیریل سے آگاہ ہو سکتی تھی۔ اسے اپنے وجود کے سچ سے آگاہ ہونے کے لیے ایک اصل یعنی کہانی لازماً درکار تھی۔ اس نے شہلا کی سنائی گئی کہانی کو ایک ایسے مکمل سچ کے طور پر لیا، جس کی ٹھیک ٹھیک نقل کرنے کی اس نے خواہش کی۔ خدا

کے بندو، مکمل سچ کے دعوے کا اعتبار نہ کرنا، اور نہ مکمل سچ کے زیر اثر آنا۔ انسانی دنیا میں مکمل سچ کے دعوے نے ہمیشہ تشدد اور جارحیت کو جنم دیا ہے۔ اگر ثمینہ کسی ٹی وی سیریل میں کسی بڑی عمر اور جوان عورت کا معاشقہ دیکھتی، اور اسے مکمل سچ سمجھ لیتی تو اس کی کہانی کچھ اور ہوتی۔ وہ مکمل سچ کی جارحیت کا شکار ہوئی، کیوں کہ وہ تمھاری طرح تشکیک کی اہمیت سے واقف نہ تھی، اس لیے کہانی کے کوہِ ندا کی طرف دوڑی دوڑی چلی گئی۔

یہ کہتے ہی سر، ڈائس چھوڑ کر چلے گئے۔ تھک گئے تھے، لیکن ہم سب ایک نئی دنیا کی طلسمی حیرت میں تھے!!

اگلے دن مجھے یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ میں اسائنمنٹ کے لیے کس کی کہانی منتخب کروں؟ کہانی کے کوہِ ندا سے تو میں ڈر ہی گیا ہوں۔ آپ ہی میری مدد کیجیے۔

■◆◆◆◆◆◆◆■

کفّارہ

پہلی مرتبہ اللہ بخشے نے ،اسی گاؤں کے خداداد کو للکارا: 'یہ تم کیا ہر بات کی ذمہ داری اس کے نام پر تھوپ دیتے ہو۔ اپنے گناہوں کی گندگی خود سے دور کرنے کا کیا آسان طریقہ اختیار کر لیا ہے تم نے'۔ وہاں بیٹھے سب لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ سپڑ سپڑ چائے کے گھونٹ بھرتے ایک نوجوان نے بے اختیارانہ انداز میں اپنی کرسی آگے کھینچ لی۔ جماہیاں لیتے ایک ڈھلتی عمر کے آدمی کو اچانک جھرجھری سی آئی۔ چائے بناتے شخص نے مٹی کے تیل کے چولھے کی لو کم کی۔ بنچ پہ لیٹے، اونگھتے بوڑھے نے بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ اٹھنے سے پہلے تہد کی ڈبکوں کو کسا۔ پھر سامنے بیٹھے سفید کتے پر ایک نظر ڈالی جو جانے کب سے اسے ٹکر ٹکر دیکھے چلا جا رہا تھا۔ شناسائی کی ایک بھولی بسری لہر بوڑھے اور کتے کی آنکھوں میں ایک ساتھ ہمک گئی۔ 'ہونہہ، شابش اے'۔ اسی دوران میں ایک موٹر سائیکل زن سے گزرا۔ اونگھتے بوڑھے نے آنکھوں کو ملتے ہوئے مٹی کے ذرے نکالنے کی کوشش کی، اور موٹر سائیکل جیسی واہیات مشین بنانے والوں اور اس پر سواری کرنے والوں کو ایک موٹی سی گالی دی۔ اسے اپنی آنکھ میں سے کسی اہم شے کے اچانک گم ہو جانے کا باقاعدہ صدمہ ہوا تھا۔

اللہ بخشے نے خداداد کو غور اور اطمینان سے دیکھا۔ ڈھلتی عمر، چھریرا کمزور بدن، سیاہ گھنی بھنوؤں کے نیچے روشن آنکھیں۔ اللہ بخشے کو کوئی شے اپنی آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خداداد کی آنکھوں میں فوری طور پر سمجھ میں نہ آنے والی ایک انوکھی سی چمک تھی، جس کا اثر کسی رعب دار لفظ سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مگر اللہ بخشے نے خود پر قابو پاتے ہوئے، آہستہ، قرأت کے انداز میں کہا: 'جانتے ہو

گناہ کیا ہے؟ تم لوگ صرف گناہ گناہ کی رٹ لگانا جانتے ہو۔ گناہ بیان میں آجائے تو گناہ نہیں رہتا تم بس زبان کو آلودہ کرنا جانتے ہو۔ اونگھتے بوڑھے کو کچھ پلے نہیں پڑا، مگر اسے یہ واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کا صدمہ کچھ کم ہوا ہے۔ آہستہ آواز میں ضرور کوئی جادو ہوتا ہے، جس کا اثر دلیل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چائے پیتے نوجوان نے سوچا۔ خداداد نے اپنی آنکھوں کو اللہ بخشے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا: 'میں بس اتنا جانتا ہوں کہ اس چائے کے پیالے کو جگ کہنا گناہ ہے، اور اگر یہ پیالا مجھ سے ٹوٹ جائے، اور میں اس کی ذمہ داری تم پر تھوپ دوں تو یہ اپنے گناہ کی گندگی خود سے دور کرنے کا آسان طریقہ ہے۔' گاؤں کی سب سے بڑی گلی کے عین بیچ چائے مٹھائی کی دکان پر بیٹھے سب لوگ ان دونوں کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ انھیں 'گناہ کیا ہے' کے سوال سے کوئی دل چسپی پیدا نہ ہوئی تھی، مگر ٹوٹے پیالوں کے ذکر نے ان کی توجہ کھینچ لی تھی۔ وہ سب، کچھ کچھ بے چین بھی نظر آنے لگے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں، مگر اللہ بخشے کی موجودگی انھیں کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔ جانے کتنی نسلوں کے تجربے نے انھیں طاقت کو فی الفور محسوس کرنا سکھا دیا تھا، اور اس کے مقابلے میں خاموش رہنے کی تربیت بھی کر دی تھی۔ بس بے چینی ایک ایسی حالت تھی ،جس پر وہ قابو پانے سے تاحال قاصر تھے۔

اللہ بخشے کا کچھ عرصہ پہلے گاؤں کے ہائی سکول میں تبادلہ ہوا تھا۔ اس کا تعلق جھنگ شہر سے تھا۔ وہ سکول ہی کے ایک کمرے میں رہتا تھا، جہاں سکول کا چپراسی اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتا تھا۔ چھٹی کے بعد وہ اسی دکان پر آجایا کرتا تھا۔ نماز کے اوقات میں مسجد چلا جایا کرتا۔ رات گئے تک باقی وقت وہیں گزارتا۔ گاؤں کے لوگ اس کے دینی اور سیاسی علم سے متاثر تھے، لیکن وہ کبھی سوال کرتا، کبھی کہانیاں سناتا، اس سے لوگ مرعوب ہوتے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اللہ بخشے کی باتوں کو کسی نے للکارا تھا۔

اللہ بخشے پہلی مرتبہ تھوڑا سا ڈرا۔ تاہم اس نے اپنے ڈر کو ایک پل میں دور کر لینے کا فیصلہ کیا ،اور کہا: 'اگر میں یہ پیالہ دیوار میں دے ماروں، یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، اور ایک آدھ ٹکڑا سامنے پڑے کتے کو جا لگے تو پیالے کا ٹوٹنا گناہ ہوگا یا کتے کا اتفاقاً زخمی ہونا گناہ ہوگا؟' کتے کا نام لیتے ہوئے

اس نے ایک نامعلوم جذبے کے تحت ، خداداد کے بجائے وہاں بیٹھے بوڑھے کی آنکھوں میں جھانکا۔حملہ سخت تھا،مگر خداداد پریشان نہیں ہوا۔

'مجھے نہیں معلوم اس میں کیا گناہ ہوگا،مگر مجھے یقین ہے کہ کتے میں اگر غیرت نام کی کوئی چیز ہوئی تو وہ تمھیں پھاڑ کھائے گا'۔ وہاں بیٹھے سب لوگوں کی بے چینی میں اچانک کمی واقع ہوئی۔اللہ بخشے کی صورت میں جس طاقت کو انھوں نے پہلے محسوس کیا تھا،اب اسے حالتِ پیکار میں دیکھا تو محظوظ ہوئے۔وہ دل چسپی سے انتظار کرنے لگے کہ اللہ بخشے کس رخ سے حملہ آور ہوتا ہے۔یہ چھوٹا سا مجادلہ نما کھیل ،انھیں اس بڑے کھیل کی مدھم سی یاد دلانے لگا تھا، جو خود ان کے اندر کتنی ہی نسلوں سے جاری تھا۔وہ کچھ کچھ خود سے واقف ہونے لگے تھے۔

'یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم لفظ گناہ کا استعمال وہاں کریں، جہاں اس کا موقع محل ہے۔اگر کتا مجھے کاٹے گا تو بالکل ٹھیک کرے گا،لیکن اگر میں نے کتے کو دھوکا دیا کہ وہ میرے بجائے ،کسی اور کی وجہ سے زخمی ہوا ہے،اور اس پر چڑھ دوڑے تو یہ گناہ ہے'۔اللہ بخشے کا جواب تھا۔

'میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ گناہ،اس وقت گناہ ہے، جب وہ بیان میں آجائے۔تم اسے دھوکا کہتے ہو، میں بیان کہتا ہوں'۔خداداد ترنت حملہ آور ہوا تھا۔اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔'کتے کو دھوکے دینے کا مطلب کیا ہے؟ کتے کو اس کی زبان میں بتانا...نہیں صرف بتانا نہیں، بلکہ سمجھانا بھی کہ اس کو تکلیف کس نے پہنچائی۔کتے کی زبان کون سمجھتا ہے؟...کتے کے گناہ کی زبان کون سمجھ سکتا ہے؟'

اللہ بخشے کے سوا کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔اللہ بخشے کو بھی بس اتنا محسوس ہوا کہ جیسے اسے کسی نے بھرے میلے میں کبڈی کے دنگل میں چت کر دیا ہو۔اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔اس سے مزید ایک لفظ نہیں بولا گیا۔وہاں موجود لوگوں کو افسوس ہوا کہ ایک دل چسپ کھیل اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ان کے چہروں سے یہ بات آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی کہ انھیں تاسف تھا کہ خود سے واقف ہونے کا جو سنہری موقع انھیں اتفاقاً ملا تھا،وہ اس قدر مختصر ،عارضی اور بے اعتبار ثابت ہوا تھا۔لیکن یہ تاسف جلد ہی ایک اور طرح کی راحت میں بدل گیا۔انھیں عارضی اور فانی چیزوں سے نفرت سکھائی گئی تھی ،اور جب کبھی اس نفرت کے اظہار کا موقع ملتا،انھیں راحت محسوس ہوتی تھی۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اللہ بخشے اور چند دوسرے لوگ جوتے گھسیٹتے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔

کوئی جنگل نما مقام ہے۔ ایک ایسا درخت ہے، جس کی جڑیں پانی میں ہیں۔ ایک دوسرے میں الجھی، میڑھی میڑھی جڑیں وہاں تک نظر آتی ہیں جہاں تک نگاہ جاتی ہے۔ انھیں دیکھتے ہوئے نگاہ میں بھی بل پڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ جڑوں سے اوپر دیکھیں تو سرمئی، کالے، نیالے رنگ کے کئی ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ رکے ہوئے، ٹنگے ہوئے۔ ادھر ادھر بھی اسی طرح کی ٹکڑیاں ہیں۔ میں درخت کے نیچے لیٹا ہوں۔ پانی پر ٹکا ہوا۔ نہ میری پشت بھیگ رہی ہے، نہ میں نیچے دھنس رہا ہوں۔ حیرت یہ ہے کہ اس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی۔ کوئی محویت ہے، جسے میں محسوس نہیں کر رہا۔ اچانک کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دیر بعد مجھے پتا چلتا ہے کہ میرے پاؤں اب زمین پر ہیں۔ میں ننگے پاؤں ہوں۔ مجھے چلنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔ میں بھاگنا چاہتا ہوں، مگر لگتا ہے زمین نے پاؤں جکڑ لیے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی، مگر پھر بھی لگتا ہے کہ میں ان کی آمد کا مقصد سمجھ گیا ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں ہیں، اسی قسم کی جنھیں میں نے کئی سال پہلے اپنے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بچھڑے کے ذبیحے کے موقع پر دھوتیاں باندھے لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی شکلیں بھول گئیں، مگر چھریاں اندر کسی جگہ کھب کر رہ گئیں۔ اس کے بعد اچانک مجھے اس بچھڑے کی کٹتی گردن، اور اس سے شرر شرر ابلتے خون کی پھوار یاد آئی۔ بس یہی دو ایک لمحے تھے، جب جنگل، لوگ نظر سے اوجھل ہوئے، اور انھی لمحوں میں، میں یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ چھری بلند کی۔ وہ خون آلود تھی، میں صرف یہی دیکھ سکا۔ باقی سب لوگ آگے بڑھ آئے تھے۔ انھوں نے بھی پہلے کی

تقلید کی۔ مجھے اندھیرے میں سرخ لکیریں نظر آنے لگیں، جو متحرک تھیں اور ایک دوسرے سے جڑنے کی سعی کر رہی تھیں۔ ہم تمھیں اس کے نام پہ قربان کرنے آئے ہیں۔ یہ تحریر میں نے ان سرخ لکیروں کے حروف جوڑتے ہوئے پڑھی۔ میں نے سعی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ جوں ہی میں نے یہ تحریر پڑھی، میری دنیا بدل گئی۔

خدایا یہ کیسا خواب تھا! اتنا واضح، اتنا روشن کہ بغیر اس کے ارادے کے، وہ اس کے ذہن میں دہرایا جا رہا تھا۔ اسے لگا وہ خواب کو موٹے حرفوں میں لکھی گئی باتصویر کتاب کی مانند پڑھ رہا ہے۔ یا خدا، یہ کون سی کتاب ہے، اور کس نے لکھی ہے، اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال نے کتاب کے حروف کو دھندلانا شروع کر دیا۔ ایک روشن خواب سے بیدار ہونے کے بعد کیا کرنا چاہیے، اس کا علم اسے کہاں تھا۔ ایک چھوٹا سا سوال کس طرح خواب کی کتاب کے حروف پر شب خون مارتا ہے، اس کا تجربہ تو اسے ہو گیا۔ اسے ذرا ذرا سہی، مگر یہ بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ خواب کے مطلب پر سوال، خواب کی مملکت میں مداخلت ہوتی ہے۔ خواب کی مملکت کہاں ہے، یہ بات اسے پوری طرح معلوم نہیں تھی، مگر اس روشن خواب کے بعد اسے محسوس ہوا تھا کہ خواب کی مملکت، بیداری کی دنیا سے کہیں پرے ہے۔ وہ خواب کی مملکت کے اس اصول سے بھی قطعی نابلد تھا کہ جب کوئی خواب، بیداری کی حالت میں آدمی کے ارادے کے بغیر خود کو دہرانے لگے تو وہ بیداری کی دنیا کی حدوں کو وسیع کر رہا ہوتا ہے؛ ایسا خواب بیداری کی سمٹی سکڑی دنیا میں ان چیزوں کو شامل کر رہا ہوتا ہے، جن کے بارے میں ہم بھول چکے ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے کس قدر اہم ہیں۔ ایسے میں آدمی اگر ارادے اور سوال کو بیچ میں لے آئے تو یہ ایسا ہی ہے کہ گھر کی منڈیر پر اچانک آ بیٹھنے والے ایک اجنبی، حسین پرندے کو آدمی اس طرح گھور کے دیکھے کہ وہ اڑنے پر مجبور ہو جائے، اور منڈیر پر وہی کالے بھدے کوے کائیں کائیں کرنے لگیں۔ خداداد کو کسی جبلی احساس کے تحت خواب کے حروف کے دھندلانے کا افسوس ہوا۔ اس افسوس کی نوعیت کچھ کچھ وہی تھی جس کا تجربہ ہم سب کانچ کے اس فریم کے اچانک ٹوٹ جانے پر کرتے

ہیں، جسے ہم نے اپنے بچپن کی ایک یادگار تصویر کے لیے ابھی ابھی خریدا ہو۔ اسی دوران میں خداداد کو اللہ بخشے کی آنکھ کی اشارت کی یاد آئی۔ تاسف کی جگہ ہلکے سے غصے نے لے لی۔ ہونھ۔ اللہ بخشے تم! اس نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی چارپائی کے دائیں پائے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک یخ لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ 'میں اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہوں؟' اس نے بے بسی سے سوچا۔

خداداد کو گناہ ثواب کی بحثوں سے گہری دل چسپی تھی، اور فوج سے صوبیدار میجر کے طور پر ریٹائرمنٹ کے بعد اس کا من پسند مشغلہ تھی، مگر اس نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ ہزاروں خوابوں میں سے کوئی خواب ایسا بھی ہوتا ہے جس میں کوئی انوکھی بات ہوتی ہے، اور اس کا گہرا تعلق خواب دیکھنے والے سے ہوتا ہے۔ اس کی توجہ اس جانب شاید ہی کبھی گئی ہو کہ خواب میں آدمی کی وہ دنیا پھٹ پڑتی ہے، جس کا سامنا کرنے سے بچنے کے وہ جتن کرتا رہتا ہے، مگر وہ دنیا عفریت بن کر اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے، اور پھر کسی خاص لمحے میں اس کو گھیر لیتی ہے، اور آدمی کو دہشت زدہ کر ڈالتی ہے۔ دہشت زدہ ہو کر آدمی ایک بار پھر بھاگتا ہے، اور عفریت مزید بڑا ہو جاتا ہے۔ خداداد نے چارپائی کے پائے کو اچانک جھٹکے سے چھوڑا، اور سیدھا اللہ بخشے کی آنکھوں میں ایک مکا رسید کیا۔ ایک طنزیہ کھلکھلاہٹ پکی اینٹوں سے بنے فرش پر چکراتی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

☆

ایک ہفتے تک اللہ بخشے اور خداداد میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ مسجد میں آمنا سامنا ہوتا رہا مگر سلام دعا بھی نہیں ہوئی۔

☆

'خدا کی قسم اس قتل میں میرا ہاتھ نہیں'۔ خداداد نے حوالات کی موٹی سلاخوں کی سختی اور موت جیسی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے فریاد کی۔ 'میں بڈھا کھڈھا کس لیے ایک جوان لڑکی کو ماروں گا۔ آخر یہ بات انھیں سمجھ کیوں نہیں آتی؟'

'حوصلہ رکھو، خداداد۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا'۔ استاد شریف نے کہا، جو ریٹائرمنٹ کے بعد مسجد میں امامت کرنے لگے تھے۔

'اللہ تو تب ٹھیک کرے گا، جب اللہ بخشے جیسے لوگ ٹھیک ہوں گے'۔ خداداد چیخ پڑا۔

'تمھیں اللہ بخشے پر کیوں شک ہے؟ کیا اس نے پولس کو تمھارا نام لکھوایا؟' استاد شریف کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔

'میں نے کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی، کسی کا حق نہیں مارا۔ سب کی عزت کی۔ میری بیٹی نہیں، مگر دوسروں کی بہن، بیٹیوں کو ہمیشہ باپ کی نگاہ سے دیکھا۔ میں ایک جوان بیٹے کا باپ ہوں۔ باپ کے جذبات رکھتا ہوں۔ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ میں کسی کو کیا منھ دکھاؤں گا؟ کس کس کو صفائی پیش کروں گا؟' خداداد بولے چلا جا رہا تھا۔

'دیکھو، خداداد، یہ باتیں کتنی ہی صحیح ہوں، مقدمے سے بری ہونے کے لیے بے کار ہیں۔ ٹھوس ثبوت پیش کرنا ہوگا'۔ استاد شریف نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

'کیا تمھیں میری بے گناہی میں شک ہے؟' خداداد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

'میرے شک، یا یقین سے فرق نہیں پڑتا۔ پولس کے شک کو رفع کرنا ضروری ہے، کسی ٹھوس ثبوت کے ساتھ'۔ استاد شریف جیسے ایک طالب علم کو سمجھا رہے تھے۔

'تمھارے شک یا یقین سے فرق نہیں پڑتا؟ شریف، تم کتنے ظالم ہو! ہر آدمی کے شک یا یقین سے فرق پڑتا ہے۔ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے'۔ خداداد نے استاد شریف کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

'ہاں، ہاں مجھے یقین ہے کہ تم بے گناہ ہو، لیکن اصل مسئلہ...'

خداداد نے استاد شریف کی بات اچک لی۔ 'تمھارے لیے اصل مسئلہ پولیس کو یقین دلانا ہے، اور اس کے لیے ثابت کرنا ہے کہ میری نہ تو شیخوں سے دشمنی ہے، نہ ان کی لڑکی کے قتل میں میرا سیدھا یا الٹا ہاتھ ہے۔ تفتیش سے سب پتا چل جائے گا کہ قتل کرنے والا کون ہے، اور اس کا الزام لگانے والا کون؟ مگر میرے لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم اور دوسرے لوگ میرے متعلق کیا سوچتے ہو۔ میرا مرنا جینا تم لوگوں کے ساتھ ہے'۔

'ہم کون سا تمھارے لیے برا سوچیں گے میرے یار'

'جانتے ہو جنگ کیا ہوتی ہے؟'

'یار تم پھر وہی مناظرہ کروگے، گناہ ثواب کا۔ تمھارے اندر کا فوجی ابھی ریٹائرنہیں ہوا۔ ویسے تم پہلے فوجی ہو جو سوچتے بھی ہو۔ مگر اس وقت تم جس مشکل میں پھنسے ہو، اس سے نکلنے کا سوچو۔ باقی بحثیں گاؤں میں کرلیں گے۔'

'میں تم سے بحث نہیں کررہا۔ تمھیں سمجھا رہا ہوں۔ میری خبر لینے آئے ہو تو میری حالت بھی سمجھو۔'

'اچھا سمجھاؤ بابا'۔ استاد شریف نے سپاہی کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، جس نے اسے صرف چند منٹ ملنے کی اجازت دی تھی، اور وہ بھی گولڈ لیف کا ایک پیکٹ لینے کے بعد۔

'تم جنگ کو عراق، افغانستان، شام، وزیرستان میں دیکھتے ہو۔ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ایک آدمی پر قتل کا الزام سب سے بڑی جنگ ہے۔ قتل کے الزام کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس سے ایک قاتل چھوٹ جاتا ہے، اور ایک اور قتل ہو جاتا ہے، اور جب تک وہ قتل نہیں ہوتا، اسے لڑنا پڑتا ہے، ہر جگہ اور ہر وقت، اور ہر اس آدمی کے ساتھ جو اسے جانتا ہے۔ میں حالتِ جنگ میں ہوں۔ میں رہا ہو بھی گیا تو یہ جنگ ختم نہیں ہوگی'۔

استاد شریف نے جماہی لیتے ہوئے کہا: 'لگتا ہے تم پر ایک فوجی کا جنگی جنون سوار ہے۔ تم بے گناہ ثابت ہو جاؤ گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک سادہ سی بات کو اتنا مشکل کیوں بنا رہے ہو؟'

'ایک بڈھے پر ایک جوان لڑکی کے قتل کا الزام ایک سادہ بات ہے؟ شریف تم نے بچوں کو پڑھایا ہوگا، مگر آدمی کو نہیں سمجھتے'۔ یہ کہتے ہوئے خداداد کے ذہن میں اچانک ایک شبیہ سی کوند گئی۔ اس نے حوالات کی سلاخوں کو زور سے پکڑ لیا۔ شبیہ اس تیزی سے اس کے ذہن میں وارد ہوئی کہ اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اس پر ہنسے، یا روئے، افسوس کرے، یا خوشی محسوس کرے۔ اس نے بس خود کو بے اختیار محسوس کیا۔ لیکن اس نے ساتھ ہی یہ محسوس کیا کہ بے اختیاری کی حالت کو زیادہ دیر تک سہارا نہیں جا سکتا۔ ایک نامعلوم قوت آدمی کو اس حالت سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس نے استاد شریف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

'شریف، معافی چاہتا ہوں کوئی بات بری لگی ہو۔ مجھے بے وجہ لڑائی لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ الزام صرف مجھ پر نہیں، اس لڑکی پر بھی ہے۔ مجھ پر قتل کرنے کا الزام ہے، اور اس پر میرے

ہاتھوں قتل ہونے کا الزام ہے، اور اس کے ساتھ الزامات کا ایک سلسلہ...'

'خدا ہم سب کو معاف کرے'۔ استاد شریف یہ کہہ کر رخصت ہونے لگا۔

'تم جانتے ہو، میں معافی میں یقین نہیں رکھتا، سزا میں یقین رکھتا ہوں۔ معافی مانگنا سودے بازی ہے'۔

اس سے پہلے کہ خداداد مزید بحث کرتا۔ استاد شریف نے جانے کی اجازت لی۔ ڈیوٹی پر مامور سپاہی سے مصافحہ کیا، محرر کو جھک کر سلام کیا، اور چلا گیا۔

☆

رات...گلی کے درمیان میں ایک گھر کے باہر بلب کی زرد روشنی کانپ رہی ہے...سانس تیز چلنے کی آواز....دل کے تیز دھڑکنے کا باقاعدہ شور...ڈر...کوئی آنہ جائے.....جلدی کرلو....ٹھیک ہے....اینٹھن کے ختم ہونے کی تڑپا دینے والی لذت....جست در جست لگاتا دھارا....

اوہ، آہ کس قدر لذت آفریں! وجود کو آخری سرے تک سیراب کر دینے والی گھنی، شیریں لذت۔ جیسے ایک نیا جسم مل گیا ہو، جیسے جسم میں رینگتی، بوڑھی، مردہ ہوتی زندگی کا اچانک خاتمہ ہو گیا ہو، اور اس کی جگہ ایک نئی، بے نیاز، خود اپنے آپ میں مگن، ولولہ خیز کھلنڈری ہستی سما گئی ہو۔ اوہو، خواب....دھت تیرے کی۔ کیا میں واقعی بے گناہ ہوں؟ خداداد نے رانوں پر لجلجے سیال کو حقارت سے محسوس کرتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ پندرہ سالوں بعد پہلی مرتبہ ہی ایسا کیوں ہوا؟ اور ایسے موقع پر ،اور ایسے شخص کے ساتھ، جس کے قتل کا الزام مجھ پر ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ قتل میں نے ہی کیا ہو، اور بھول گیا ہوں۔ کوئی قتل کر کے بھول بھی سکتا ہے؟ انسانی قتل....جس سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھیانک نہیں...اتنی بڑی دنیا کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے سے زیادہ بھیانک کیا ہوسکتا ہے، جسے زندہ آدمی پیدا کرتا ہے، اور ہر وقت محسوس کرتا ہے..آدمی کو بھلانا ممکن ہے، مگر آدمی کے قتل سے جو بھیانک پن پیدا ہوتا ہے، اسے کون بھلا سکتا ہے؟ شاید شیطان....کیا میں شیطان ہوں؟ شاید عادی مجرم...میں عادی مجرم ہوں؟ اگر قتل میں نے کیا ہے تو کیا میں اس کا جشن بھی منا رہا ہوں؟ قتل کا جشن کون مناتے ہیں؟

اسے اپنی فوجی زندگی کا خیال آیا۔ ایک فوجی دو دنیاؤں میں جیتا ہے۔ وطن کی دنیا اور وطن کے دشمنوں کی دنیا۔ وطن دشمنوں کو مارنا قتل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اگرچہ کسی دشمن کو نہیں مارا تھا، مگر دشمنوں کے مارے جانے کی خبریں ضرور سنی تھیں۔ اسے اپنی یادداشت پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آیا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے دشمن کے مرنے پر جشن منایا ہو۔ وہ الجھتا جا رہا تھا۔ جسے میں نے آج تک نظر بھر کر دیکھا نہیں، اس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ؟ اسے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ ایک طرف اسے اپنی گیلی رانیں محسوس ہو رہی تھیں، اور دوسری طرف پریشان کن خیالات آ رہے تھے۔

اس نے سکول کالج کے زمانے میں کچھ کہانیاں پڑھی تھیں۔ اسے اچانک ایک کہانی یاد آئی۔ وہ ایک عورت کی کہانی تھی، جس کا شوہر قتل ہو گیا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ بستر پر لیٹی ہے، جس نے اس کے شوہر کو قتل کیا تھا۔ مصنف نے عورت کے چہرے کو رات کی تاریکی میں ایک انوکھی چمک سے دمکتے ہوئے دکھایا تھا، وہ دمک اور اس سے وابستہ حیرت آج تک اس کے ذہن سے چپکی ہوئی تھی۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ مصنف نے لکھا تھا کہ صبح کو لیکن عورت سخت پشیمان تھی۔ وہ اس کہانی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس کے باوجود اس کے ذہن میں یہ چپکی ہوئی تھی۔ آج اسے یہ کہانی کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ اس وقت اسے لگا تھا کہ عورت ایک ایسی پہیلی ہے جسے کوئی سمجھ نہیں سکتا، مگر اب اسے لگا کہ انسان ایک پہیلی ہے۔ نہیں پہیلی تو سخت عامیانہ لفظ ہے۔ جس ہیبت انگیز بوالعجبی، جس ہولناک مضحکہ خیزی کو اس نے ابھی ابھی مشاہدہ کیا ہے، اسے پہیلی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چیزوں اور تجربوں کو نام دینے میں کتنا محتاط ہونا چاہیے، اس کا احساس تو اسے قتل کا الزام لگنے کے بعد ہی ہونے لگا تھا..... اسے یہ بات بھلائے نہیں بھولتی تھی کہ جس لمحے وہ جست در جست دھارا کی منزل کو پہنچا تھا تو ایک ناقابل بیان لذت اس کے پورے جسم کو سیراب کر گئی تھی۔ اس کا جسم اب تک ایک سرشاری کی حالت میں تھا، مگر ذہن عجب الجھنوں کا شکار تھا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کے اندر واقعی ایک جنگ برپا ہے۔ ایک ایسی جنگ، جس کا اس نے پہلے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس جنگ کو روح اور جسم کی جنگ کا نام دیتے ہوئے ڈر لگا۔ اتنی بڑی جنگ کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس نے خود کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ وہ اس سب کو بھلانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے گویا اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کا

ارادہ کیا۔اس کے باوجود وہ اپنے اس ڈر کو نہیں چھپا سکا کہ خدا معلوم اس جنگ کا کیا نتیجہ نکلے؟یا خدا، میں کن الجھنوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔اس نے بے بسی سے سوچا۔اس کے ساتھ ہی اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس خواب کی الجھن پہلے خواب کی الجھن سے مختلف تھی۔ پہلا خواب تو ایک عکس تھا ،جسے اللہ بخشے کے خیال نے مٹا دیا تھا،مگر یہ خواب....یہ خواب کب تھا....اس نے لجلجے پن کو کراہت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

اسے استاد شریف ناشتہ پہنچایا کرتا تھا۔ابھی وہ نہیں آیا تھا۔وہ صف پر لیٹا، بایاں ہاتھ سر کے نیچے دیے،سوچے چلا جا رہا تھا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے بتانے آئی تھی کہ تمھارا کوئی قصور نہیں۔لیکن اس نے عجب طریقہ اختیار کیا۔کیا واقعی وہ اوباش تھی،اور اس کو جس نے قتل کیا،ٹھیک کیا؟ لیکن کیا اس کا قاتل،اس کے عمل کی سزا جزا کا اختیار رکھتا تھا؟ خداداد کو اچانک خود پر غصہ آیا۔کیا مجھے اس کو اوباش کہنے کا حق ہے،جس نے مجھے....لذت...سیراب...تف،لعنت ہے،اس ذہن پر۔مرنے کے بعد کسی سے اس حالت میں....وہ بھی تو عورت تھی....پندرہ سال ہوئے....آج تک وہ اس طرح خواب میں نہیں آئی....صرف دو مرتبہ خواب میں آئی تھی۔وہ بیٹے کو پیار کر رہی تھی ،اور مجھے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری مرتبہ ایک شادی کا منظر ہے،وہ اپنی بہن اور باپ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی ہے،اور وہ اسے دیکھتے ہوئے بس گزرتا ہے۔وہ کبھی اکیلی ، بے لباس نظر نہیں آئی ،مگر وہ...وہ جسے اس نے فقط اس ایک لمحے میں سڑک پر لیٹے اس طرح دیکھا کہ اس کے سینے کا ابھار سب سے نمایاں تھا۔قمیص کا نچلا حصہ اٹھا ہوا تھا،اور گندمی پیٹ سے ذرا نیچے ہلکے بھورے،سیاہ بال دکھائی دے رہے تھے۔اس نے آنکھیں بند کیں تو گندمی پیٹ اور ہلکے بھورے،سیاہ بال اس قدر واضح نظر آئے ،جس قدر اس نے چند دن پہلے چمکتی چھریوں کو خواب میں دیکھا تھا۔وہ باقاعدہ ڈر گیا۔

کس کو کیا کرنا چاہیے، یہ بات اس نے ان بحثوں کے بعد سوچنا شروع کی تھی ، جو اللہ بخشے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ محض وقت گزاری کی خاطر کرنے لگا تھا۔اس کا بیٹا ہر ماہ اسے دس ہزار بھجوا دیا کرتا تھا،اور بیس ہزار اس کی پنشن تھی،اسے معاش کی فکر نہیں تھی۔اس کی والدہ حیات تھیں جو بوڑھی ہونے کے باوجود گھر کے کام کیا کرتی تھیں۔ پانچ وقت مسجد جانا، رشتہ داروں کی موت

فوت، شادی بیاہ پر جانا، اور باقی وقت ہوٹل پر باتیں کرنے گزارنا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ ہوٹل پر جہاں اسے گاؤں کے ایک ایک گھر کی خبر مل جاتی تھی، وہیں ہر خبر اور واقعے پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ گناہ ثواب کی بحث کا آغاز گاؤں کے ایک نوجوان کے حادثے میں ہلاکت کی واقعے کے بعد ہوا تھا۔ گاؤں میں لوگ مرتے رہتے تھے، عورتیں اکثر قتل ہوتی تھیں، مگر ایک نوجوان کی ہلاکت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا میڈیکل کالج میں ایک سال پہلے داخلہ ہوا تھا۔ اس کے موٹر سائیکل کے حادثے میں مرنے کا لوگوں پر عجب اثر ہوا تھا۔ وہ اس موت کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ طرح طرح کی تاویلیں کر رہے تھے۔ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا کیا گناہ تھا۔ وہ لوگ جرم کا لفظ شاید ہی استعمال کرتے ہوں، ہر ایسے کام کو گناہ کہنے کے عادی تھے، جس کے ٹھیک نہ ہونے کا انھیں یقین ہوتا تھا۔ اللہ بخشے کو یہی بات ناگوار گزرتی تھی۔ وہ لوگوں کے خیالات کو صحیح کرنے کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتا تھا۔

استاد شریف ناشتے میں انڈہ آلو بنوا کر لایا تھا جو اس کی ماں نے بنا کر بھیجا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے، وہ ایک نئی الجھن کا شکار تھا۔ اگرچہ اس نے ڈیوٹی پر مامور سپاہی کو سو روپے دے کر غسل کی حاجت پوری کر لی تھی، مگر وہ خواب اپنے کیا، کیوں کے ساتھ اس کے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ نوالے توڑتے ہوئے، اسے کبھی بدن کا کساؤ یاد آتا، کبھی اینٹھن کے بعد جسم کا ایک گہری لذت کے ساتھ ڈھیلا پڑنا اور کبھی ایک بڑا سا ''کیوں'' اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگتا۔ اگر ایسا ہونا ہی تھا تو صرف وہی کیوں جس کے قتل کے الزام میں، مَیں حوالات میں بند ہوں۔ خدایا، یہ کیسا راز ہے! کیا خدا نے مجھ پر کسی راز کا انکشاف کیا ہے؟ میرے اندر کا راز میرے منھ پر دے مارا ہے؟ دیکھو، تم اصل میں یہ کچھ ہو۔ اگر میں یہی کچھ ہوں تو الجھن کس بات کی؟ مجھے اپنی اصل حقیقت کے آگے اپنا سر جھکا لینا چاہیے۔ لیکن یہ کیسی میری حقیقت ہے جو مجھے اس طرح پھاڑے جا رہی ہے جس طرح کانٹے اس کپڑے کو پھاڑے ڈالتے ہیں، جسے زور سے کھینچا گیا ہو۔ میرے اندر کانٹے کہاں سے آئے؟ اسے لگا کوئی اسے اندر سے مسل رہا ہے۔ کوئی پتھر ہے جو اس کے سینے پر مسلسل دباؤ بڑھا رہا ہے۔ اسے واقعی پسینہ آنے لگا تھا۔ وہ تیز تیز نوالے چبانے لگا، جیسے کسی غیر مرئی شے کو دانتوں سے کچلنے کی کوشش کر رہا

ہو۔ وہ کراہتے ہوئے سوچنے لگا، یا خدا آدمی اپنی عزت بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، اور کوئی اسے ایک گہری دلدل میں دھکیل دے۔ کاش وہ اس 'کوئی' کو پہچان سکتا! اس کی بے بسی بڑھتی جا رہی تھی، جس سے نکلنے کا واحد راستہ اسے یہ نظر آتا تھا کہ وہ اپنی حالت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ سوچنے لگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ فطرت نے اس کی پارسائی کے دعوے کا جواب دیا ہے؟ لیکن کیا اس نے غلط کہا کہ اس نے قتل نہیں کیا۔ ایک سیدھی سادی حقیقت کے بیان اور پارسائی کے اظہار میں کیا فرق ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اس کی بزدلی کی سزا ہے؟ اگر وہ لاش کو دیکھتے ہی سب کو اطلاع کر دیتا تو شاید اس مصیبت سے بچ جاتا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ نماز کو قضا نہیں ہونے دے گا۔ کیا اس نے نماز کی خاطر انسانی وجود کی بے حرمتی کی تھی، جو جانے کس وقت سے اکھڑی اینٹوں کے سولنگ پر بے ڈھنگے پن سے پڑا تھا؟ ایک انسانی وجود مرنے کے بعد جس لازمی تکریم کا مستحق ہوتا ہے، کیا اس نے اس کے سلسلے میں کوتاہی کی تھی؟ وہ استاد شریف کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے، اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اسے لگا کہ اسے ایک بڑے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ مگر اس نے جواب پر غور کرنے سے پہلے اپنے ساتھ پورا سچ بولنے کا عہد کیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے اس آزمائش میں مبتلا ہوا تھا کہ اسے آدمی کا ساتھ دینا چاہیے، یا خدا کا۔ وہ اس آزمائش سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا، مگر عجیب بات ہے کہ اس سے نکلنے کا راستہ اسے پہلے سے معلوم تھا۔ خدا اور اس کے حکم کی تعمیل کے مقابلے میں آدمی کی اوقات ہی کیا ہے؟ اس نے ایک لمحے ہی میں خدا کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ نماز ادا کر رہا تھا، اسے نوری کے سینے کا ابھار، گندمی پیٹ، بھورے سیاہ بال اور سرد چہرہ برابر یاد آتا رہا تھا، مگر اس نے پوری توجہ نماز پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نماز ہر حال میں فرض ہے۔ اس خیال کی مدد سے اس نے لاش کے خیال کو جھٹکنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے پورے خشوع و خضوع سے اب تسلیم کیا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔ لیکن کیا واقعی؟ وہ ایک بار پھر الجھ گیا۔ اسے یاد آیا، وہ گندمی پیٹ کے نیچے بھورے سیاہ بالوں کو دیکھ کر ڈر بھی تو گیا تھا۔ اس ڈر کی وجہ سے وہ بھاگ کر مسجد پہنچا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک اور خیال نے اسے جکڑ لیا۔ ابھی چند دن پہلے اس نے اللہ بخشے سے کہا تھا کہ گناہ جب بیان میں آجاتا ہے تو گناہ ہوتا ہے۔ کیا اس پر نوری

کے قتل کا الزام، بیان کی صورت اس کا گناہ بن گیا ہے؟ اور اب اسے اس گناہ کی سزا جھیلنی ہے، یا کفارہ ادا کرنا ہے۔ لیکن وہ الجھا... جست در جست دھارا... کیا وہ کفارہ ادا کر سکے گا؟ یہ تو بیان میں نہیں آیا، اس لیے گناہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں اس میں الجھتا کیوں جا رہا ہوں۔ استاد شریف کے بار بار پوچھنے پر اس نے بہانہ کیا کہ رات وہ سو نہیں سکا، جس کی وجہ سے اس کی طبیعت سخت بے زار ہے۔ حقیقت میں اس نے استاد شریف سے جھوٹ بولا۔ اس کی طبیعت بے زار نہیں تھی، وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس نے اپنے روبرو یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کے جسم نے کئی سالوں بعد ایک انوکھی راحت محسوس کی تھی، مگر جسم کے سوا جو کچھ تھا، وہ پھوڑا بن چکا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونا چاہتا تھا، لیکن اس کے گلے میں جیسے آواز بند ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ حوالات کی سلاخیں توڑ کر پھانسی گھاٹ پہنچ جائے۔

'تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں، میں کوئی دوا لاتا ہوں'۔ استاد شریف پیناڈول لینے چلا گیا، جسے گاؤں کے سب لوگ ہر دکھ تکلیف میں ابتدائی طبی امداد کے طور پر چائے کے ساتھ استعمال کرنے کے عادی تھے۔ خداداد نے اسے نہیں روکا۔

پولیس نے تفتیش شروع کی تو شیخوں کی لڑکی کے قتل کا معما جلد ہی حل ہو گیا۔ لڑکی کو اس کے بھائی نے قتل کیا تھا۔ اس نے پولیس کے سامنے اقبال جرم کر لیا۔ اس کا بھائی پورے گاؤں میں جیب کترے کے طور پر مشہور تھا۔ اکثر غائب رہتا، اور کسی دن اچانک نئے، قیمتی کپڑے پہنے گاؤں کی گلیوں میں ادھر سے ادھر آتا جاتا، اونچی آواز میں سب کو سلام دعا کرتا نظر آتا۔ ایک شام گھر پہنچا۔ سب گھر والوں سے ملا۔ صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹتے ہوئے، ادھر ادھر دیکھا۔ 'نوری کہاں ہے؟' 'بتا کر نہیں گئی۔ اپنی ماسی کے گھر گئی ہوگی' ماں نے بتایا۔ آدھ گھنٹا گزرا۔ نوری نہیں آئی۔ اسے بے چینی سے محسوس ہوئی۔ اٹھا اور سیدھا ماسی کے گھر گیا۔ نوری وہاں گئی ہی نہیں تھی۔ 'کہاں ہوگی؟' بے چینی، غصے میں بدل گئی۔ واپس گھر آ رہا تھا تو نوری بھی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ 'کہاں تھی، کس ماں کے یار کے پاس گئی تھی؟' غصہ برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ 'تمھیں کیا؟ تم کون ہوتے ہو، مجھ سے پوچھنے والے؟' نوری نے تڑاق سے جواب دیا۔ 'میں بتاتا ہوں، میں کون ہوں؟' وہ اس کا گلا دبانے لگا۔ لیکن ماں اور

چھوٹے بھائی نے نوری کی جان بچالی۔ جب صبح ہونے کے قریب تھی۔ وہ اٹھا،اور نوری کا گلا دبا دیا۔لاش گلی میں پھینک کر غائب ہوگیا۔اسی گلی میں خداداد کا گھر تھا۔بس میں ایک مسافر کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا۔پولیس نے چھتر لگائے تو اپنی اکلوتی بہن کے قتل کا اعتراف بھی کرلیا۔قتل کا سبب یہ بتایا کہ کچھ عرصے سے اس کے دوست اسے کہہ رہے تھے۔

دوسروں کی جیبیں کاٹتے ہو،تمھارے عزت کی جیب کٹ چکی ہے۔

کیا بکواس کرتے ہو؟

نوری کو جانتے ہو؟ یا ہفتوں ،مہینوں باہر اپنی عیاشیوں میں مگن رہنے سے بھول ہی گئے ہو؟ دوستوں کا لہجہ بہت درشت تھا۔

میری بہن کا نام اب تم نے اپنی گندی زبان سے لیا تو کچا چبا جاؤں گا۔اس نے ایک دوست کا گریبان پکڑ لیا۔

میری زبان گندی ہے،اور تمھاری بہن کتنی گندی ہے کچھ خبر ہے؟ کئی کئی یار ہیں،اس کے۔

اگر یہ بات غلط ہوئی تو میں تم سب پر کلاشنکوف کا برسٹ ماروں گا۔

جناب،ایک جیب کترے کی بھی عزت ہوتی ہے،اس نے پولیس کے سامنے بیان میں کہا۔

جب میں نے ایک شام اسے گھر سے غائب دیکھا تو جس شک کا بیج دوستوں نے بویا تھا،وہ یقین میں بدل گیا۔

کیا تو نے اسے کسی کے ساتھ دیکھا؟ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

نہیں۔وہ گھر میں نہیں تھی۔

کیا کبھی کوئی تمھارا دوست تمھارے ساتھ گھر آیا؟ سب انسپکٹر نے اگلا سوال کیا۔

ہاں جی اکثر آتے تھے۔

اوئے انورا،ذرا اس کی خدمت کرو۔غیرت کے نام پر بہن کو ٹھکانے لگانے والے بے غیرت تجھے یہ تک نہ پتا چلا کہ تیرے دوست ہی تیری بہن کے یار بننے کی کوشش کررہے تھے۔کام نہ بنا ،اور ڈر سے کہ کہیں نوری تجھے بتا نہ دے،انھوں نے تجھے بھڑکا دیا اور تو بھڑک گیا،اتنا بھڑک گیا کہ اس

کا گلا گھونٹ دیا۔

انورا آیا، اس نے اسے الٹا، ننگا لٹا کر آٹھ دس چھتر لگائے۔ یہی تمھاری عزت ہے نا! ایک سپاہی نے پوری قوت سے چھتر برساتے ہوئے کہا۔

نوری کا قتل گاؤں کے لیے شروع میں ایک واقعہ تھا، لیکن اس کے بھائی کی اقبال کے بعد واقعہ نہیں رہا تھا۔ اس طرح کے قتل ہوتے رہتے تھے۔ گاؤں میں اس طرح کی خبر ذرا سی ہولناکی اور ڈھیر ساری سنسنی پھیلاتی تھی۔ مرنے والی کا غم عام طور پر ماں، بہن، بیٹی کو ہوتا تھا، اور بعض اوقات تو انھیں بھی نہیں۔ ایسے قتل کا فاتحہ درود بھی نہیں ہوتا تھا۔ دو چار لوگ جنازہ پڑھتے تھے اور خاموشی سے انھیں پُور دیا جاتا تھا۔ ابھی پچھلے سال انور شاہ نے اپنی بیوی کو پار لگا دیا تھا۔ اس کا دیوار کا جھگڑا اپنے ہمسائے شاہد سیال سے ہوا تھا۔ شاہد نے گھر کے آگے دکان کھڑی کی تو اس کی دایاں دیوار اس جگہ تک پہنچ گئی، جہاں انور شاہ نے گیٹ لگانا تھا۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا، لوگ اکٹھے ہوئے۔ انور شاہ نے شاہد کو ماں کی گالی دی۔ شاہد نے گالی کے جواب میں چیختے ہوئے کہا، اپنی سوانی کا خیال کر جو مصلی تک کو نہیں چھوڑتی۔ یہ لوہے کا گیٹ بھی اسے نہیں روک سکتا، جس کے لیے تو اتنا چوڑا ہو رہا ہے۔ انور شاہ نے شاہد کا گریبان پکڑ کر زور کا تھپڑ اس نے منہ پر مارا۔ اس کے جواب میں شاہد نے وہی الزام مزید اونچی آواز میں دہرایا۔ اگلے دن انور شاہ نے تھانے میں پیش ہو کر اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ ایک سال بعد جیل سے رہا ہو گیا کہ مقدمے کی پیروی کسی نے نہیں کی۔ انور شاہ نے رہا ہو کر پیری مریدی کا دھندہ شروع کر دیا۔ جب نوری کے بھائی کو جیل میں بھیجا گیا ہے تو اس کی ماں اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے انور شاہ سے رَکھ پھُل لینے گئی۔ گاؤں میں سب نے ایک خاموش معاہدہ کر رکھا تھا کہ جس لڑکی یا عورت کی شہرت خراب ہو جائے، اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ٹھکانے لگانے والا باپ ہو، شوہر ہو، یا بھائی بہادر اور غیرت مند سمجھا جاتا تھا۔ چند مہینوں بعد نوری کا بھائی بھی رہا ہو گیا تھا۔

خداداد پر الزام کا معما بھی بالآخر حل ہو گیا۔ خداداد پہلا آدمی تھا جس نے صبح کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے نوری کی لاش دیکھی۔ ایک نظر ادھر ادھر دیکھا اور کچھ سوچ کر مسجد چلا گیا۔ نماز پڑھ کر واپس آیا تو گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ تھانے میں نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج ہوا۔ نوری

کے بھائی پر اس لیے کسی کو شک نہیں ہوا کہ اس کا علی الصبح گھر سے بغیر بتائے چلے جانا معمول تھا۔ تاہم وہ جنازے میں شریک ہوا تھا، اور تھوڑا بہت سوگوار بھی لگ رہا تھا۔ ایف آئی آر کٹنے کے اگلے دن خدا داد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ خداداد کو لاش کے پاس رکتے ہوئے، اور پھر آگے بڑھتے ہوئے شاہد سیال نے دیکھا تھا۔ اسی نے تفتیشی کو یہ نکتہ سمجھایا تھا کہ نوری جب رفع حاجت کے لیے گھر سے نکلی ہے تو خداداد ،جس کی بیوی کا انتقال پندرہ سال پہلے ہو گیا تھا، نوری کی طرف بڑھا، اس کے انکار اور شور مچانے پر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ پوسٹ مارٹم میں تو یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نوری کی موت گلا گھونٹنے سے ہوئی تھی۔

خداداد پندرہ سال پہلے فوج سے ریٹائر ہو کر آیا تھا تو اس نے اپنی پنشن سے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکیلے کاروبار کرنے کے بجائے بھائیوالی (شراکت داری) کا سوچا، تا کہ اگر نقصان ہو تو آدھا ہو۔ جب اسے شاہد سیال نے بھائیوالی کی پیشکش کی تو جھٹ راضی ہو گیا۔ وہ جدی پشتی ایک دوسرے کے پڑوسی چلے آتے تھے۔ خداداد نے شاہد کو تین لاکھ اپنے حصے کے دیے تھے، جس سے اس نے مویشیوں کا فارم بنایا۔ شاہد نے پہلے سال بیس ہزار بہ طور منافع دیے تھے، باقی پر جھگڑا اب تک چلا آتا تھا۔ جھگڑے چکانے کا یہ طریقہ بھی گاؤں میں عام تھا۔ اللہ بخشے لوگوں سے بحث مباحثہ کرتے ہوئے اکثر برا مان جایا کرتا تھا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن اس کے چہرے کے تاثرات خوف ناک ہو جایا کرتے تھے۔ اس دن کی بحث نے خداداد کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے خواب نے اس خوف کو اور بڑھا دیا تھا، یا اس کا خواب ہی بڑھے ہوئے خوف کو ظاہر کرتا تھا۔ نوری کے بھائی کے اقبال سے چند دن پہلے شاہد اسے حوالات میں ملاقات کے لیے آیا۔ کہنے لگا، میں نے تفتیشی سے بات کی ہے۔ اگر تم ایک لاکھ کا بندوبست کر دو تو وہ تمھیں بے گناہ لکھ دے گا۔ 'خدا کی لعنت ہو تم پر۔ اگر میں نے گناہ کیا ہے تو اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے' یہ سن کر شاہد نے ایک موٹی سی گالی دی، اور تھوکتا ہوا چلا گیا۔ خداداد کے بیٹے کو تفتیشی نے بتا دیا کہ شاہد ہی نے اس کے باپ کو پکڑوایا تھا۔

یہیں خداداد کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہوئی۔ آخر اس کا دھیان شاہد کی طرف کیوں نہیں گیا؟ وہ کس قدر کوڑھ مغز ہے۔ وہ کس قدر متکبر ہے۔ اس دنیا کے بارے میں اس کا علم کس قدر ناقص ہے جسے وہ بھگت رہا ہے، اور جو دنیا محض خیالوں اور بحثوں میں ظاہر ہوتی ہے، اس کے بارے

ہیں وہ کس قدر غرور کے ساتھ بحث مباحثہ کرتا ہے! کوئی اپنے سامنے کی دنیا سے اس قدر بھی بے خبر ہوسکتا ہے؟ ہاں ، میں ہوں نا! خداداد یہ تو تم تسلیم کروگے کہ تم جیسے، بڑے بڑے مسئلوں پر جھگڑے کرنے والے، سامنے پڑی چیزوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ سامنے بیٹھے اس کتے سے بے خبر ہوتے ہیں جو ایک ہی لمحے میں ان کے جھگڑے نمٹا سکتا ہے۔ خدا کے گھر جانے والے، گلی میں پڑی اس لاش سے بے خبر ہوتے ہیں، جو ان کا جینا حرام کرسکتی ہے، اور ان کی ساری عمر کی عبادت غارت کرسکتی ہے۔ خداداد تمھیں ماننا ہوگا کہ تم دو دنیاؤں کے باسی ہو۔ تمھاری ٹانگیں ایک دنیا میں ہیں جہاں شاہد سیال جیسے لوگ رہتے ہیں اور تمھاری کھوپڑی دوسری دنیا میں ہے جہاں اللہ بخشے راج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم اللہ بخشے کی دنیا میں مغز کھپاتے ہوئے بھول جاتے ہو کہ تمھاری ٹانگیں کن روڑوں، کس گاب، کس کھڈے سے ٹکرا کر ٹوٹنے والی ہیں، اور تمھاری کھوپڑی کے غرور کو مٹی میں ملانے والی ہیں۔ خداداد ، وہ لمحہ کس قدر مصیبت کا ہوتا ہے ، جب آدمی کی کھوپڑی اس کی ٹانگوں میں گھسڑ جائے۔ اسے اچانک لگا کہ یہ لمحہ تقریباً اسی طرح کا ہے، جب آدمی چائے کا گھونٹ بھرے اور اسے لگے کہ چائے میں مکھی تھی جو اس کے حلق تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مکھی کو نگل سکے، نہ اگل سکے۔ آخر کس پانی کے کتنے غراروں سے آدمی کا حلق پاک ہوسکتا ہے! ٹانگوں میں گھسی کھوپڑی کو کون نکالے؟ خدا جانے ٹانگوں ہی میں کھوپڑی پہلے سے موجود ہو، یا کھوپڑی میں آدمی کی ٹانگیں ہوتی ہوں۔ میں خداداد، خدا کو حاضر ناظر جان کر تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری اصلی دنیا کون سی ہے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ مجھے اپنی ٹانگوں کو بچانا ہے یا کھوپڑی کو۔ میں اپنی ٹانگوں سے اپنی کھوپڑی کو الگ کرسکتا ہوں یا نہیں، مجھے کچھ خبر نہیں۔ میں دل و جان سے یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ آدمی کی عقل، آدمی ہی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ آدمی کا جسم آدمی ہی کی قدرت سے باہر ہوسکتا ہے۔ یا خدا، میں یہ کس سے پوچھوں کہ آدمی کے جہل کا..... بے خبری کا..... بے بسی کا..... تکبر کا... کوئی کفارہ ہوتا ہے؟ روح کی رہائی کے محضر پر کون دستخط کرتا ہے؟ کیا میری مصیبت ختم ہوسکتی ہے؟ خداداد رہائی کے بعد پہلی رات گھر میں کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے چلا جا رہا تھا۔

اگلی صبح خداداد نوری کی قبر پر گیا۔ واپس آ کر اللہ بخشے سے ملا۔

'تمھیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ جب آدمی تکلیف میں ہو تو کسی نہ کسی پر ذمہ داری تو ڈالتا ہی ہے۔ مجھ پر ذمہ داری نہ ڈالتے تو کسی اور پر۔ اور پھر ہمیں بحث آگے بڑھانے کے لیے کوئی نیا موضوع بھی تو چاہیے تھا۔ چند دن اچھے گزر جائیں گے'۔ اللہ بخشے نے خداداد کو چھی ڈالتے ہوئے کہا۔

'معافی کو چھوڑیں، بخشیں بھی ہم کرتے ہی رہیں گے، پہلے مجھے ایک مسئلہ بتائیں۔ آپ مجھ سے زیادہ مذہب کا علم رکھتے ہیں' خداداد ملتجی ہوا۔

'کیا کسی کی موت کے بعد اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے؟' خداداد نے آنکھیں جھکائے ہوئے کہا۔

اللہ بخشے پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

■•◆•◆•◆•■

ولدیت کا خانہ

وہی ایک قصہ تھا جو گھروں، دکانوں اور نماز کے بعد مسجد کے باہر کچھ دیر کے لیے جمع ہونے والے زیادہ تر بوڑھے لوگوں کے درمیان چل رہا تھا؛ اور ماسی جنداں اور دادی سداں کے تنوروں پر اکٹھی ہونے والی عورتوں کی زبان پر تھا۔ مہنگائی، دوسروں کی غیبت، چھوٹی موٹی چوریوں، نوجوانوں کے معاشقوں، پاس پڑوس کے بیماروں، یہاں تک کہ مر جانے والوں کا ذکر اذکار سب تھم سا گیا تھا۔ وہ قصہ ہی ایسا تھا۔ کسی کو یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ اس قصے کا ابتدائی خاکہ کیسے، اور کس کے ذریعے یہاں پہنچا تھا۔ انھیں قصے سے دل چسپی تھی، قصے کی تاریخ سے نہیں۔ البتہ قصے کے راوی سے دل چسپی ضرور تھی کہ اس نے ایک ایسا قصہ ان تک پہنچایا تھا، جس کو جتنی بار دہرایا جاتا، اتنا ہی لطف آتا۔ ہر بار اس قصے کا راوی بدل جاتا اور ہر بار اس قصے میں نئے واقعات شامل ہو جاتے تھے، اور ہر بار اسے نئے، زیادہ قابل یقین طریقے سے بیان کیا جاتا۔ وہ قصہ اپنے راوی کے اندر عجب جوش بھر دیتا تھا۔ وہ اس جوش کی رو میں بہ جاتا، کچھ اس طرح جیسے اسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو، اور اسے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ وہ اس خزانے کا کیا کرے، جس نے اسے ایک دم اہم آدمی بنا دیا ہے۔ وہ بڑے آدمی کی طرح ہی سب کو قصہ سناتا۔ ایک بات اس گاؤں کے سب لوگوں نے بھی دریافت کی تھی کہ وہ قصہ پرانا ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس میں بہ یک وقت میٹھے اور نمکین چاولوں جیسا ذائقہ تھا۔ ہر روز یہ قصہ دہرایا جاتا، نئے انداز میں کئی کئی بار دہرایا جاتا، اور ہر بار پہلے سے زیادہ دل چسپ اور پہلے سے زیادہ قابل یقین لگتا تھا۔ ایک دن عصر کی نماز کے بعد مسجد کے دروازے پر جمع بوڑھوں سے، چھٹی پر آئے ہوئے ماسٹر احمد نے یہ تبصرہ

کیا کہ اب یہ قصہ رہ ہی نہیں گیا، ہمارے گاؤں کا ایک جیتا جاگتا فرد بن گیا ہے۔ سب نے حیرت سے منہ پھاڑے ماسٹر کی طرف دیکھا، جیسے اس قصے میں ایک نیا موڑ اچانک آیا ہو، اور کوئی شخص قصے سے نکل کر، ان کے درمیان آ کھڑا ہوا ہو۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف شک اور دلچسپی سے دیکھا۔

کوئی دو ہفتے تک قصہ دلچسپ بھی رہا، اور حیرت انگیز بھی۔ اس قصے کا ایک عجب طلسمی ہالہ سب کو اپنی گرفت میں لیے رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خوف نے انھیں آلیا۔ انھیں یہ جاننے میں وقت لگا کہ اس قصے نے ایک طرح سے ان کی اجتماعی روح پر قبضہ کر لیا تھا۔ سب کو اس قبضے کا مدھم سا احساس تھا۔ وہ سب ایک زنجیر میں بندھ گئے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ڈرے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے تھے۔ پہلی بار ایک دوسرے کے اس قدر قریب آئے تھے۔ مگر زنجیر کو توڑنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔

> کل کی بات ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بارہ ایک کا ٹائم تھا۔ چک مراد کی ایک لڑکی کو سائیں شریف کے پاس لایا گیا۔ وہ بارہ سال سے بیمار تھی۔ اس کی بیماری کسی نے سنی نہ دیکھی۔ اسے بخار آتا اور ہچکی لگ جاتی۔ دس دس دن ہچکی لگی رہتی۔ نہ کچھ کھا پی سکتی، نہ سو سکتی۔ کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی۔ سائیں بوہڑ کے درخت تلے دری بچھا کر بیٹھے تھے۔ وہاں کوئی خلقت تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ گڑ کے بھورے کے گرد چیونٹیاں جمع ہو گئی ہوں۔ مگر کوئی کھسر پھسر تک نہیں تھی۔ ایک پتھر جیسی چپ تھی، اور انتظار تھا۔ کافی دیر تک سائیں نے آنکھیں بند رکھیں۔ پھر اچانک کھولیں۔ عورت کو دیکھا۔ فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو جھٹکا دیا۔ جیسے آدمی کو کرنٹ لگتا ہے۔ سب مخلوق ڈر گئی۔ یا اللہ خیر۔ سب کے منہ سے ہولے سے نکلا۔ ساری خلقت کی آنکھیں سائیں کی طرف اٹھی تھیں۔ انتظار تھا کہ کیا فرماتے ہیں۔ بالآخر انتظار تمام ہوا۔ ارشاد ہوا۔ چنا، گنجا، کیکر۔

جانتے ہو، اس کا مطلب کیا تھا؟ شام کے وقت ہوٹل پر جمع لوگوں کی طرف خاصے مرعوب کن انداز میں دیکھتے ہوئے، یعقوب نے پوچھا۔

تمھیں معلوم ہے، سائیں شریف کا مطلب کیا تھا؟ گاؤں کے حکیم کی دکان پر بیٹھے لوگوں سے غلام محمد نے پوچھا۔

پتہ ہے، سائیں نے کیا بتایا؟ تنور پر آنے والی عورتوں سے فاطمہ نے کہا۔

چٹا، گنجا، کیکر سے سائیں کا مطبل کیا تھا؟ سارا دن جانور کی طرح کام کرنے والی نوراں نے اپنے گھر بڑے نکھٹو شوہر سے پوچھا۔

ان سب میں یعقوب ہی مستند راوی تھا، کیوں کہ وہ سائیں شریف کی مجلس میں موجود تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک دم بتا دے کہ ان تین لفظوں کا کیا مطلب تھا۔ اسے لگا تھا کہ اس کے پاس خزانہ ہے۔ اس خزانے پر صرف اس کا اختیار ہے۔ اس اختیار نے اس میں طاقت بھر دی ہے، اور یہ طاقت عجب طرح کی ہے۔ اس طاقت کا اسے قطعاً تجربہ نہیں تھا۔ وہ اس طاقت سے کچھ کچھ ڈرا ہوا تھا۔ وہ اس طاقت کے نئے پن سے ڈرا ہوا تھا۔ اس ڈر کے دوران میں اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس خزانہ نہیں، ایک راز ہے۔ نہیں خزانہ بھی تو ایک راز ہے۔ ڈر کے ساتھ وہ ایک طرح کی لذت بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ڈر اور لذت کے تعلق سے واقف نہیں تھا، مگر دونوں کو ایک ساتھ محسوس کیے جا رہا تھا۔ یعقوب نے پہلی دفعہ دریافت کیا کہ کوئی ایسا خزانہ اور راز بھی ہو سکتا ہے، جس کا تعلق لفظ کے مطلب سے ہو۔

سائیں لفظ بولتا تھا اور ایک گہری خاموشی میں چلا جاتا تھا۔ پاس ہی اس کا ایک خاص مرید بیٹھا ہوتا جو سائیں کے لفظوں کا مطلب بتاتا تھا۔ مجلس میں تو سب لوگ مرید کی بات تسلیم کر لیتے تھے، مگر بعد میں کچھ کچھ شک کرنے لگتے تھے۔ لیکن یہی شک، گاؤں میں دہرائے جانے والے قصوں کی بنیاد تھا۔ کچھ خودسر نوجوان کھلے لفظوں میں یہ تک کہہ دیا کرتے تھے کہ شک کی ذمہ داری خود سائیں پر ہے۔ آخر وہ پورا جملہ کیوں نہیں فرماتا تھا۔ یہ خودسر نوجوان، بوڑھے اور عورتیں سب اس بات سے چڑتے بھی تھے کہ سائیں پورا جملہ کیوں نہیں بولتا تھا۔ وہ اپنی دنیا کو پورے جملے سے سمجھنے کے عادی تھے یا وہ صرف اُسی کو اپنی دنیا سمجھتے تھے جو پورے جملے میں سما جاتی تھی۔ محض تین لفظ، تین بے ربط لفظ اور ان کے درمیان خالی جگہیں.... ان کی دنیا سے باہر کی چیز تھیں۔ وہ چڑتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ خالی جگہیں ایک پر اسرار کردار کو ایک ایسی طاقت دے رہی ہیں جو ان کی مانوس دنیا کو تہ و بالا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ

ان خالی جگہوں کو خود پُر کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے' تا کہ ان پر سائیں کے اجارے کو کم کر سکیں' لیکن پھر ڈر جاتے تھے کہ انھیں خالی جگہوں کی پر اسراریت کا سامنا کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا!

یعقوب نے کافی دیر سے منتظر لوگوں پر بالآخر یہ راز کھول دیا کہ سائیں کے خاص مرید نے چٹا، گنجا، کیکر کا مطلب یہ بتایا تھا کہ چٹے دن کو ایک گنجے آدمی نے کیکر کے درخت کے نیچے اس لڑکی سے زیادتی کی تھی۔ آدمی اور کیکر سے تعلق تو سب کی سمجھ میں آتا تھا، مگر 'زیادتی' کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟ مرید کا کہنا تھا کہ سائیں کو ہر آدمی کے گرد ایک ہالہ نظر آتا ہے، جس میں وہ سب لوگ، جگہیں، واقعات دکھائی دیتے ہیں، جن سے آدمی کا تعلق رہا ہے۔ مرید سے بھی کسی کو اختلاف کی جرأت نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جس چیز نے لوگوں کو حیرت میں ڈالا تھا، اور خوف زدہ کیا تھا، یہی ہالے کا نظر آنا تھا۔ شاید لوگوں کو یقین نہ آتا۔ لیکن ایک دن ایسا واقعہ ہوا کہ سب کو یقین آ گیا۔ اس روز سائیں نے اپنی مجلس میں بیٹھے گاؤں کے مولوی صاحب کی طرف دیکھا اور ایک دم کہہ ڈالا: کالی، نکاح۔ مرید نے وضاحت کی کہ مولوی صاحب نے ایک کالے رنگ کی عورت سے نکاح کیا ہے۔ مولوی صاحب نے بھی اقرار کر لیا کہ انھوں نے چند ہفتے پہلے دوسرا نکاح کیا ہے۔ اس سے اگلے دن گاؤں کے لائن مین شرافت کو دیکھ کر سائیں نے کہا: دو، بیس، ایک۔ کسی کے پلے نہیں پڑا۔ سائیں کے مرید خاص نے بتایا کہ اس شخص کے دو باپ ہیں، ایک وہ جس نے جنم دیا، اور ایک وہ جس نے اسے پالا، اور بیس سال پہلے پالا، اور وہ ایک ہے ماں باپ کا۔ شرافت کو اس کے چچا نے پالا تھا، جب شرافت کے ماں باپ بیس سال پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ سائیں کی کرامت پر لوگوں کا یقین اپنی آخری حد کو پہنچ گیا، اور وہ ڈر گئے۔ انھیں اب کوئی شک نہیں رہا کہ سائیں نہ صرف جملے میں خالی جگہیں پیدا کر سکتے ہیں' بلکہ انھیں پُر کرنے کا کلی اختیار بھی رکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کا قطعی تجربہ نہ تھا کہ لفظ ان کی حقیقی زندگی سے کتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں' اور کوئی شخص محض لفظوں پر اختیار کی مدد سے' ان کی روزمرہ کی زندگی پر حکمرانی کر سکتا ہے۔

اب لوگ وہاں جانے سے کترانے لگے تھے۔ وہ اپنے ہالے سے ڈرنے لگے تھے، نہیں اس ہالے کے پہچانے جانے سے ڈرنے لگے تھے۔ جس بات کو قدرت نے راز رکھا ہے، سائیں اس کو

سب کے سامنے لے آتے ہیں، وہ قدرت کے کاموں میں دخل دیتے ہیں۔ اب لوگ سائیں کے حوالے سے نئی تاویلیں کرنے لگے تھے۔

☆

وہ شام کے قریب سائیں کی مجلس میں پہنچا۔ کم لوگ رہ گئے تھے۔ وہ ذرا دور ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا، جب سب چلے جائیں تو سائیں کے سامنے جائے، اور وہ اس کے دل کا حال جانیں، اور اسے اذیت سے نجات دلائیں۔ سائیں نے سر کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا: مولا۔ خاص مرید سمجھ گیا کہ سائیں اب خلوت چاہتے ہیں۔ 'سب لوگ چلے جائیں۔ سائیں کی عبادت کا ٹیم ہو گیا ہے'۔ اس نے ملتجی نظروں سے خاص مرید کی طرف دیکھا، جسے لوگ شاہ صاحب کہنے لگے تھے۔ شاہ صاحب نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ 'ہاں کیہ گل اے' (کہو کیا بات ہے)۔ شاہ صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے شاہ صاحب کی مٹھی اپنی مٹھی میں لی، اور رقت سے کہا۔ 'اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں'۔ شاہ صاحب نے سب کو جانے کا کہہ دیا۔ 'ہاں ہُن دس' (اب بتاؤ)۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے ایک نظر سائیں کے چہرے پر ڈالی۔ گیسوؤں میں آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبوتری ناک جیسے سجدے کی حالت میں تھی۔

میں کیسے کہوں۔ دماغ پھٹ رہا ہے۔ پندرہ سالوں سے ہر دن لگتا ہے، دماغ پھٹ جائے گا۔ میں جی نہیں رہا۔ مر نہیں رہا۔ پندرہ سالوں سے لگتا ہے کوئی میری گردن پر چڑھا بیٹھا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔

قصہ لمبا نہ کر، مطلب کی بات کر۔

ہاں حضور۔ مجھے مافی دے دو۔ میں گناں گار ہوں۔ سائیں مجھے بس اتنا بتا دیں۔ اکرو، کس کا بیٹا ہے۔ اسے جنا میری زنانی نے ہے، مگر وہ میرا نہیں۔ اس کی شکل صورت میرے سے، یا میرے خاندان کے کسی بندے سے نہیں ملتی۔ وہ رنگ کا کالا ہے۔ قد چھوٹا ہے۔ ناک پتلی ہے۔ یہ میری ناک دیکھو پکوڑے جیسی ہے۔ میرے بھائی، والد سب کی ناکیں ایسی ہیں، لیکن اکرو، مادر چود کی ناک.... سائیں مجھے بتاؤ.....وہ کس کے تخم سے جنا ہے۔ وہ میرے گھر میں، کس خنزیر کی اولاد ہے۔ جس وقت

میں نے اس کی شکل دیکھی تھی، اس وقت سے میرا جینا حرام ہے۔ میں اسے ساتھ لے آتا مگر میں کیا بہانہ کرتا اسے لانے کا؟ سائیں مجھے دیکھ کر بتا دیں....

پریشان نہ ہو۔ سائیں تجھے ضرور بتائیں گے۔ پر یہ بتا تو کرے گا کیا؟

میں اس کے باپ کو قتل کروں گا۔

ٹھیک ہے۔ پر اکرو.. یہی بتایا نہ اپنے بیٹے کا نام.....

نہیں وہ میرا بیٹا نہیں۔ بس اس کا ان پانی میرے گھر لکھا تھا۔ پر اب میں....

اکرو کا کیا کرے گا۔

اسے بھی مار ڈالوں گا۔

اب تک مارا کیوں نہیں؟

وہ چپ ہو گیا۔ اس کے منہ سے پہلی مرتبہ اکرم کو مارنے کے ارادے کا اظہار ہوا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ اسے آج تک اسے مارنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ اسے آج تک پیار نہیں کر سکا، مگر اسے مار ڈالنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔

لیکن اب میں مار ڈالوں گا۔

ٹھیک ہے۔ تمھارا مال ہے.... میرا مطلب ہے، تمھارے پاس وہ جی ہے، جیسے تمھارا جی کرے۔ سائیں نے ایک دفعہ پھر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ مولا۔ شاہ صاحب نے اسے چلے جانے کو کہا۔ کل آنا، سائیں آج نہیں بتائیں گے۔

☆

اگلے دن پورے گاؤں میں اکرم کی ولدیت کا قصہ گردش کر رہا تھا، قصہ کیا تھا، بگولہ تھا جس کی لپیٹ میں پورا گاؤں تھا۔ کسی کی چادر، کسی کا برقع، کسی کے قمیص کا دامن اس بگولے سے اترا جا رہا تھا۔ تنور سے لے کر مسجد تک، حکیم کی دکان سے حجام کی دکان تک، ہر جگہ ہر گھر میں یہ سوال نما قصہ تھا کہ اکرم، شیخ اسمٰعیل کا بیٹا نہیں تو کس کا ہے؟ کون کس کا ہے، کون کس کا یار ہے؟ کون کیا کرتا رہا ہے۔ بگولے سے گاؤں کی کتاب کے ورق پھٹے جا رہے تھے اور ادھر ادھر اڑے جا رہے تھے۔ ہائے کیا زمانہ

آ گیا ہے، اب قیامت آئے کہ آئے۔ عورتیں حرام کے بچے پیدا کر کے اروڑی پر نہیں پھینکتیں، گھر میں پالتی ہیں۔ تمھیں یاد ہوگا، جب سیلاب آیا تھا تو نہر میں ایک ایک دو دو روز کے کتنے بچوں کی لاشیں ملی تھیں۔ سب حرام کے تھے۔ پر ان کی ماؤں کی لاشیں بھی تو تھیں۔ ایک عورت تو مری پڑی تھی، مگر اس کا پیٹ سانس لے رہا تھا۔ دائی صاباں کہتی تھی، اس کے پیٹ میں زندہ بچہ ہے، پر کون حرامی بچے پالتا ہے۔ نی، تمھیں بھول گیا ہے کہ کرم مسور کا بیٹا جو پولس میں ہے، وہ شمو مراثن کا ہے، جسے کرم نے ایک کھولے سے اٹھایا تھا۔ نہیں وہ صاحباں بھروانی کا ہے، جسے شمو مراثن کھولے میں پھینک گئی تھی۔ جس کا بھی ہے، وہ نیک بچا ہے۔ سب کو سلام کرتا ہے۔ توبہ ہے۔ اس نے تو ایک حرام کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا، پر شیخ اسمٰعیل اپنے سگے بیٹے کو حرام کا بتاتا ہے۔ اللہ قیامت کیوں نہیں آتی۔ اتنے سال اسے خیال نہیں آیا۔ اس کی بیوی دیکھنے میں تو شریف لگتی ہے۔ پر عورت ذات کا کیا بھروسا۔ جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی تو برقع پہن کر اسی سڑک سے گزر کر شہر جاتی تھی۔ شریف عورتیں اکیلی شہر نہیں جاتیں۔ خدا کا خوف کرو، اس کی نوکری تھی۔ شادی کے بعد شیخ اسمٰعیل نے نوکری چھڑوائی تھی۔ ماسٹر پہلے دن سے شکی مزاج تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے کسی چکر و کر سے واقف ہو، ورنہ کون نہیں چاہتا کہ گھر میں چار پیسے آتے رہیں۔ بھائی صاحب، یہ چودھویں صدی ہے۔ نہیں جناب پندرھویں صدی ہے۔ ہاں ہاں جو بھی ہے، ان ٹیچروں کے سب سے زیادہ یار ہوتے ہیں۔ انھیں آزادی بھی تو ہوتی ہے۔ گھر میں اتوار کے دن بھی کہتی ہیں کہ ای ڈی او کے دفتر جانا ہے۔ اور اپنے یاروں سے ملنے جاتی ہیں۔ دو مہینے پہلے ٹیچر صائمہ نے سول ہسپتال سے ابارشن کروایا تھا، مجھے خود اسلم ڈرائیور نے بتایا جس کی وین میں سب ٹیچریں سکول جاتی ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ وہ ہسپتال ابارشن کروانے گئی ہو؟ میں نے تو اسے اس کی چال سے پہچان لیا تھا کہ وہ پیٹ سے ہے۔ یار یہ تمام ٹیچریں برقعے کیوں پہنتی ہیں؟ بھولے بادشاہو تمھیں نہیں معلوم، وہ نہیں چاہتیں کہ پہچانی جائیں۔ شیخ اسمٰعیل کے واقعے سے ان ٹیچروں کا کیا تعلق؟ بس ان کے ذکر سے لذت ملتی ہے۔ تمھاری ایک کزن بھی تو ٹیچر ہے۔ اس کا نام نہ لو۔ وہ میری بھابھی بننے والی ہے۔ سنا ہے، سب سے زیادہ ابارشن مراثنوں اور مصلنوں کے ہوتے ہیں۔ یار سب کے ہوتے ہیں۔ زمینداروں کی عورتوں کے گناہ بھی یہ بیچاریاں اپنے سر لے لیتی ہیں۔ اکرم دیکھنے میں

کتنا شریف اور پڑھا کو لگتا ہے۔ اس نے کبھی کرکٹ تک نہیں کھیلی۔ سنا ہے حرام کے تخم قہاری ہوتے ہیں، لیکن یہ تو کبھی گلیوں میں چلتا پھرتا بھی نظر نہیں آیا۔ اگر قہاری لڑکے حرام کے ہوتے ہیں تو تمھارا بھائی تو پکا حرامی ہے۔ ماں سے پتا کرو، کس کے ساتھ سوئی تھی۔ تڑاخ۔ یار تم تو جذباتی ہو گئے۔ ہر ماں کسی نہ کسی کے پاس تو سوتی ہے۔ نہیں ماں، صرف بچے پیدا کرتی ہے اور پالتی ہے۔ یار یہ سمجھ نہیں آتی۔ اگر بچہ حرامی ہوتا ہے تو عورت اور مرد کیا ہوتے ہیں؟ ہم نے دونوں کو معاف کر دیا، پر بچے کو نہیں۔ لیکن سنا ہے شیخ اسمٰعیل دونوں کو مارنے پر تلا ہوا ہے۔ سائیں اور شاہ صاحب آگ لگا کر رہیں گے۔ کتنے امن سے رہ رہے تھے۔ حالاں کہ پتا تھا کہ کون آدھی رات کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ کچھ باتیں چھپی رہنی چاہییں۔ خدا نے آخر رات کس لیے بنائی ہے۔ سائیں رات کو دن بنانے لگا ہے۔ لوگو، خدا کے کاموں میں دخل نہ دو۔ لیکن اس کا کیا قصور ہے۔ کیا وہ کسی کو بلا بھیجتا ہے؟ سب اپنی خوشی سے جاتے ہیں۔ تم چھپی باتوں کو جاننا بھی چاہتے ہو، اور ڈرتے بھی ہو۔ یار معلوم کرو، سائیں آیا کہاں سے ہے؟ یہ شاہ صاحب کون ہیں؟ سنا ہے، شہامند زمیندار کے پاس آئے تھے، اسی نے انھیں بوہڑ تلے بیٹھنے کی اجازت دی۔ کیا پتا شہامند کو کچھ حصہ ملتا ہو۔ تمھیں یاد ہے، شہامند کے کینی ڈیٹ کو ہمارے ٹھٹھے کے ووٹ نہیں ملے تھے۔ کیا وہ اتنا گھٹیا ہو سکتا ہے۔ آہستہ بولو، یہ زمیندار بہت ہی گھٹیا ہوتے ہیں۔ یاد ہے، اسی نے جانو ماچھی کے چھوہر (لڑکے) پر کتے چھوڑ دیے تھے۔ غریب کا قصور یہ تھا کہ وہ تیز تیز سائیکل چلا رہا تھا کہ آگے شہامند آ گیا تھا، جس پر کچھ گھٹا پڑ گیا تھا۔ چوری کا الزام لگا کر اپنا بولی کتا اس پر چھوڑ دیا تھا۔ یار آج کل تو اس کی ویڈیو بنا کر کسی ٹی وی والے کو دے دینی چاہیے۔ شاباش اے، پھر اس غریب کی خیر نہیں۔ شیخ اسمٰعیل اور شہامند کی لڑائی بھی تو ہوئی تھی۔ دونوں کی وجہ سے۔ شہامند سے کس کی لڑائی نہیں ہوئی۔ لیکن بھائی، یہ سائیں وائیں سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر اس نے یسو پنجو ہار کبوتر ڈولی جیسی زبان میں کچھ کہہ دیا اور شاہ صاحب نے اس کا مطلب یہ بتا دیا کہ اس ٹھٹھے کے سارے مرد حرامی ہیں تو کیا ہوگا۔ ہوگا کیا، مزا آ جائے گا۔ حرامی مرد تو زبردست چیز ہے۔ ہاں ہاں تمھیں تجربہ جو ہے۔ بکواس مت کر۔ میں نے سنا ہے کہ حرامی کو کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا۔ سب بڑوں کو، پیسے والوں کو، تھانیدار کو، تحصیل دار، ایم پی اے، ایم این اے، وزیر کو بھڑوا مرد برا ہوتا ہے۔

بلاوجہ تو حرامی نہیں کہتے۔ حرامی ہونا تو بڑے آدمی کا رینک ہے۔ تمھارا مطلب ہے، اکرم بڑا آدمی بنے گا۔ ہاں، بالکل اگر واقعی حرامی ہے۔ شریف ہوا تو زہر کھالے گا۔ دفعہ کرو، ان باتوں کو ہمیں کیا لینا دینا۔ دیکھو اس بار بھی بال خراب کاٹے تو اس قینچی سے ....نہیں بھائی پریشان نہ ہو... میں پانچ سال کراچی یہی کام کرتا رہا ہوں۔ اب اللہ کے واسطے، وہاں کے قصے نہ سنانا۔

کل شام شیخ اسمٰعیل کو امید بندھی تھی کہ پندرہ سالوں سے وہ جس سوال کی آگ میں خاموشی سے جل رہا ہے، اسے اس کا جواب مل جائے گا۔ گھر پہنچ کر اس نے اکرم کو کھانا کھاتے دیکھا تو پہلا خیال یہ آیا کہ بچو، اب نوالے گن لو۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو ایک نامعلوم آدمی کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا، اور دل کو مدتوں بعد مطمئن محسوس کیا۔ لیکن اگلا دن اس کے لیے ایک نئی مصیبت لایا۔ اسے لگا کسی نے اس کا سینہ چیر ڈالا ہے....نہیں.. اسے محسوس ہوا کسی نے اس کا ستر چوراہے کے بیچ کھینچ ڈالا ہے۔ کسی نے کہا تو پاگل ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا، ماسٹر بے غیرت ہے۔ پندرہ سالوں بعد آج اسے پتا چلا ہے۔ کسی نے کہا ماسٹر خدا تمھیں صبر دے، جو بھی ہے، بچے کا کیا جرم؟ چاچے رمضو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، پتر میں تیرا دکھ سمجھتا ہوں۔ پر شکل پر مت جا۔ شکلیں دھوکا دیتی ہیں۔ آدمی دھوکا دیتا ہے۔ ہاں چاچا۔ عورتیں بھی دھوکا دیتی ہیں۔ پر ماسٹر پتر، عورت مرد کے ساتھ مل کر دھوکا دیتی ہے۔ نہیں چاچا، ایک مرد کے ساتھ مل کر دوسرے مرد کو دھوکا دیتی ہے۔ تو یوں کہہ نا۔ مرد عورت دونوں دھوکا دیتے ہیں۔ ٹھیک کہا، مجھے سائیں....نہیں...شاہ صاحب نے دھوکا دیا ہے۔ کیا کہا؟ نہیں چاچا کچھ نہیں۔

گھر میں عجب خوف ناک خاموشی طاری تھی۔ اس کی بیوی نے سوجی آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ اس کی آنکھوں میں جوتوں سمیت اتر جائے گی۔ دونوں بیٹے اور چھوٹی بیٹی اسے نظر نہیں آئے۔ وہ خاموشی سے گھر کی چھت پر الانی (بغیر بستر کے) چارپائی پر ڈھ گیا۔ اسے یہ جاننے کی تڑپ ہوئی کہ وہ کون حرام زادہ ہے، جس نے شاہ صاحب کے ساتھ رازداری کی گل بات کو گلی گلی پہنچا دیا۔ اس نے کل شام کے واقعات یاد کرنے شروع کیے۔ عصر کی نماز ادا کرنے کے کوئی آدھ گھنٹہ بعد اس نے موٹر سائیکل کو کک ماری تھی۔ 'میں ذرا بھٹے تک جا رہا ہوں' کسی کو مخاطب کیے بغیر، سر پر پگڑی باندھتے ہوئے، کہا تھا، اور مغرب کی سمت جانے والی سڑک پر موٹر سائیکل ڈال دیا تھا۔ دس

منٹ میں وہ نواز کی بستی پہنچ گیا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا...بستی کے عین بیچ بوہڑ کا درخت... سائیں کی ڈاڑھی کی طرح زمین کی طرف لٹکی شاخیں.. چاروں طرف گھر... کچھ کچے، کچھ پکے.....مٹیالے سرخ رنگ کی دری... سبز جانماز.....پھل فروٹ، کپڑے، مڑے تڑے روپوں کی ڈھیری... سائیں کی زمین کو سجدہ کرتی ناک.....شاہ صاحب... مٹھی... کوئی اور نہیں تھا..... ہاں، ایک شخص آیا تھا، سائیں کے پاؤں کو ہاتھ لگایا تھا، چلا گیا تھا... نہیں وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا... وہ تو سر جھکائے، سائیں اور شاہ صاحب کے آگے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ اُس کے گاؤں کا ہوتا تو وہ پہچان لیتا۔ یوں بھی وہاں اب جانے کہاں کہاں سے لوگ آنے لگے تھے۔ اس شخص کے لیے اس کا دل غصے سے بھر گیا۔ میرے سامنے تو آئے، میں اس حرامی کو اکرو کے باپ سے پہلے اگلے جہان نہ پہنچاؤں تو میں اپنے باپ کا نہیں۔ ایک خیال اچانک اس کے دھیان میں کوندا۔ میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں اپنے باپ کا ہوں؟ وہ ڈر گیا، مگر جلد ہی اس نے اپنے ڈر پر قابو پالیا۔ ہاں میرے پاس ثبوت ہے۔ میری ماں ایک شریف عورت تھی۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اسے پہلی دفعہ پوری وضاحت سے محسوس ہوا کہ اس کی بیوی، اس کی ماں کی طرح شریف نہیں ہے۔ ایک دم اس کے ذہن میں غبار بھر گیا۔

اسے یقین تھا کہ اکرو، اس کا بیٹا نہیں۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسے کیوں یقین ہے۔ بس اکرو کا ناک نقشہ اس سے نہیں ملتا۔ پھر ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ کیا میرا ناک نقشہ میرے اپنے باپ سے ملتا ہے؟ اس نے باپ کی شکل ذہن میں لانے کی کوشش کی، مگر اس کے ذہن میں باپ کا مرا ہوا چہرہ ابھرا۔ مغرب کی نماز کے بعد اس نے باپ کو قبر میں ڈالا تھا۔ اور ٹارچ کی روشنی میں آخری بار اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ سانولا، لمبوترا چہرہ، جلد اکڑی ہوئی اور جلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنے باپ کا یہ چہرہ کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ بھول ہی گیا کہ وہ اپنے چہرے کو باپ کے چہرے میں ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ وہ ڈر بھی گیا تھا۔ مرے چہرے میں اپنا ناک نقشہ دیکھنے کی اسے ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ اسے باپ نے ہمیشہ اپنا پتر کہا۔

'ابا، اماں پوچھ رہی ہے روٹی اوپر ہی لے آؤں'۔ وہ چھوٹے بیٹے اسلم کی آواز پر چونک پڑا۔ 'ہاں، ادھر ہی لے آ'۔ اس نے جیسے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ اسے پرانی باتیں یاد کرنے میں

با قاعدہ لذت مل رہی تھی۔ آٹھویں یا نویں کے چاند کی دودھیا چاندنی میں اس نے اسلم کی پشت کو دیکھا، جب وہ سیڑھیاں الانگتے ہوئے نیچے جا رہا تھا۔ بالکل اکرو کی طرح چلتا ہے۔

اس کا دھیان اس بات پر اٹکا تھا کہ اس کا اپنا چہرہ کیسا ہے؟ اسے یاد آیا۔ لڑکپن کے دن تھے۔ وہ سکول سے آنے کے بعد جانگیہ پہن لیتا تھا، اور گلیوں میں دوڑنے لگتا تھا۔ گرمیوں کی ایک سہ پہر اس کا دادا دکان کے موڑھے پر بیٹھا تھا۔ دو آدمی پاس پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ خدا جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ دکان کے سامنے اینٹوں کے فرش پر پانی کے چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ مٹی کی سوندھی باس اٹھ رہی تھی۔ یہ باس اس وقت بھی، اتنے سالوں بعد، اسے محسوس ہو رہی تھی۔ دادا نے اسے گود میں بٹھا لیا تھا، حالاں کہ اس کا سر دادے کی ناک کو چھو رہا تھا۔ 'تمھیں دیکھتے ہی مجھے اپنا دادا یاد آ جاتا ہے۔ تمھارا ہاڑ اس کی طرح ہے'۔ دادا نے بھی نہیں بتایا کہ اس کا چہرہ کس سے ملتا ہے۔ اس کا دھیان ماں کی طرف گیا، لیکن اسے ماں کی کوئی ایسی بات یاد نہیں آئی۔ ہاں ایک بار اس کی چاچی نے کہا تھا، سماعیل تیرا متھا تیرے چاچے کی طرح ہے۔ لیکن میری شکل؟ اتنی دیر میں اسلم روٹی لے آیا تھا۔ وہ چارپائی پر سرہانے کی جانب اٹھ بیٹھا۔ اسلم نے گلاس میں پانی ڈالا، تا کہ وہ ہاتھ دھو لے۔ 'اماں پوچھ رہی ہے، چائے ابھی بنائے یا....؟' اسلم نے باپ کے ہاتھ دھلواتے ہوئے پوچھا۔ 'ہاں ابھی بنا دے'۔

اگلے دن وہ کسی سے بات کیے بغیر سکول چلا گیا۔ اس نے شکر کیا کہ اس کا سکول دس میل دور گاؤں میں تھا۔ اس کے گاؤں میں چلنے والی آندھی سے اس کی آنکھوں میں کئی ذرے پڑ گئے تھے، جو کانٹوں کی طرح اسے چبھ رہے تھے۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ کس طرح نوکری، جسے سب لوگ اپنی آزادی کے لیے پھندا سمجھتے ہیں، ایک پناہ گاہ ہوتی ہے، اتنی بڑی پناہ گاہ کہ ریٹائرمنٹ کے بعد لوگ بولا جاتے ہیں، اور کچھ کو تو سوائے مرنے کا انتظار کرنے کے کچھ نہیں سوجھتا۔ شیخ اسمٰعیل کو ماسٹر نور یاد آئے جو ریٹائر ہونے کے دو سال بعد اس وقت گزر گئے، جب وہ حج کی تیاری کر رہے تھے۔ اس نے سامنے سے آنے والی دھول اڑاتی کار دیکھ کر موٹر سائیکل کو کچے راستے پر ڈالتے ہوئے، دل میں فیصلہ کیا کہ وہ ریٹائر ہونے سے پہلے حج کر لے گا۔ لخ لعنت ای۔ کار کی دھول سے آنکھوں میں پڑنے والے ذروں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے، اس کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ آج اپنی عینک اٹھانا

بھول گیا تھا۔ وہ سکول کی پناہ میں آ کر اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہتا تھا۔ وہ پرائمری سکول دو کمروں اور دو ہی استادوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے استاد ہفتے میں صرف دو دن آتے تھے۔ آج نہیں آئے تھے۔ شیخ اسمٰعیل نے ان کی غیر حاضری پر خدا کا شکر ادا کیا۔ شیخ اسمٰعیل نے دو کلاسوں کو سبق یاد کرنے اور باقی تین کلاسوں کو پہاڑے یاد کرنے کے لیے کہا۔ ہر کلاس کا ایک مانیٹر بنا کر، وہ خود سکول کے صحن میں موجود شیشم کے درخت تلے چارپائی بچھوا کر لیٹ گئے۔ اپریل کے شروع کے دنوں میں دھوپ ذرا ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ پانچویں کے ایک طالب علم کو گھر سے چائے بنوا لانے کا کہا۔

وہ رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ لیٹنے پر اُسے آنکھیں بند ہوتی محسوس ہوئیں، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لگا کہ جیسے اس کا ذہن خاموش ہونا بھول چکا ہے۔ سنسناہٹ کی آواز سے لگتا تھا کہ کوئی تیز لہر اس کی کھوپڑی کو چٹخاتے ہوئے باہر نکل آئے گی۔ بند آنکھوں سے سنسناہٹ کو مسلسل سننا عذاب تھا۔ میرے اللہ۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر آئی۔ پنج اکم پنج، پنج دونی دس۔ ہم سب ایک ہیں۔ نو پنجا پنتالی، نو چھ چرنجا۔ ہندو، مسلمان کا دشمن ہے۔ تن اکم تن۔ بچوں کی آوازوں سے ذرا دیر کے لیے لگا کہ سنسناہٹ کچھ کم ہوئی ہے۔ استاد جی، اجی نے میری کتاب پھاڑ دتی ہے۔ اس بے غیرت کو ایک تھپڑ جڑ دو، اور میرے پاس کوئی شکایت لے کر نہ آئے۔ اوئے، بالے جا، شانی ڈسپنسر کی دکان سے ایک پیناڈال لے آ۔ جی استاد جی۔

ایک حرامی بچے کا باپ ہونے سے بڑا بھی کوئی عذاب ہوگا دنیا میں؟ اس نے جیسے اپنی صورتِ حال کو پہچانا۔ دوزخ۔ میں نے تو اسی دنیا میں دیکھ لیا ہے۔ اس کے دماغ کی سنسناہٹ بڑھ گئی۔ شاید بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔ اسے خیال آیا۔ پانی کا گلاس منگوا کر ایک ہی سانس میں پی لیا۔ ان بچوں میں سے کتنے اپنے باپ کے ہوں گے؟ اس نے ایک نگاہ ان سب بچوں پر ڈالی جو کھڑے ہو کر سبق اور پہاڑے یاد کر رہے تھے۔ سب کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا۔ اس نے چوتھی جماعت کے مانیٹر کو پکارا۔ جاؤ، گلام کمہار کے دونوں بھائیوں کو بلا لاؤ۔ ایک پانچویں اور دوسرا شاید تیسری یا دوسری میں ہے۔ جی، استاد جی۔ دونوں بچے ڈرتے ڈرتے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ایک کی ناک بھینی ہے۔ دوسرے کا ماتھا چوڑا ہے۔ ایک کی آنکھیں

چھوٹی اور کالی، دوسرے کی سرمئی اور بڑی ہیں۔ رنگ میں بھی فرق ہے۔ ایک کا سیاہ اور دوسرے کا گندمی ہے۔ تمھارے باپ کا رنگ کالا ہے یا گورا؟ دونوں طالب علم بوکھلا گئے، انھیں اس سوال کی توقع ہی نہیں تھی۔

استاد جی، کالا ہے۔ نہیں استاد جی گورا ہے۔

ایک بات کہو، کیا کبھی اپنے باپ کو غور سے نہیں دیکھا۔

نہیں استاد جی میں روز دیکھتا ہوں۔ وہ آپ کی طرح تھوڑے تھوڑے کالے ہیں۔ بڑے نے کہا۔

چھوٹا ڈر گیا، اور خاموش ہو گیا۔

اچھا، اب جاؤ۔

چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اترا تو شیخ اسمٰعیل کو اپنی طبیعت ذرا بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے خود کو اندر سمٹتے محسوس کرنا شروع کیا، اور اس کے ساتھ ہی اسے لگا کہ کچھ گرد ہٹنے لگی ہے۔ سارے فساد کی جڑ ہی عورت ہے۔ عورت ہی بتا سکتی ہے کہ اس کے پیٹ میں کس کا تخم ہے۔ عورت کو تخم سے غرض ہے، کسی کا ہو۔ نکاح کے ساتھ ہو، نکاح کے بغیر ہو۔ یہ عورت بھی کتنی واہیات ہے، بغیر نکاح کے بھی تخم ٹھہرا لیتی ہے۔ تف ہے تجھ پر۔ یہ تخم بھی تو نہیں دیکھتا کہ ...کہاں.....کیسے.....یہ تخم باپ ہے؟.....میں نہیں؟.....ہائے کیا تماشا ہے.....میں اور تخم...تخم مرد کا، مگر مرد ہی کو خبر نہیں.....اپنے تخم کی خبر نہیں.....یا میرے مالک۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ماسٹر اسمٰعیل کی زندگی میں یہ پہلا لمحہ تھا، جب اسے اپنے اندر کی اس تنہائی کا سامنا ہوا، جس میں آدمی اپنی تقدیر سے آگاہ ہوتا ہے، اور اسے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے کچھ کڑوی حقیقتوں کے روبرو ہونا پڑتا ہے۔ آدمی پر وہی لرزہ طاری ہوتا ہے جو قدیم زمانے میں دیوتاؤں جیسی آسمانی مخلوق یا ان کے قاصدوں کے اچانک سامنے آجانے پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔ ماسٹر اسمٰعیل کے ماتھے پر پسینہ نمودار ہوا۔ اس نے صافے سے پونچھتے ہوئے سوچا کہ شاید یہ گرم چائے کا اثر ہے۔ اس نے خود کو ایک غار میں محسوس کیا، جہاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک چمک سی پیدا ہوتی تھی اور وہ مزید ڈر جاتا تھا۔ اس چمک میں کچھ سوالات اسے غراتے محسوس ہوتے۔

باپ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ میرا باپ ہونا میرے تخم سے ہے؟ اتنی غلیظ شے سے میں پیدا ہوا، اور باپ کی حقیقت اس میں ہے؟ چلیں غلیظ سہی، پر میں اس کو اولاد میں محسوس کیوں نہیں کر سکتا؟ میں تو ان کے چہرے دیکھتا ہوں۔ ہونہہ، یہ چہرہ، بال، قد کاٹھ، کھوپڑی سب اسی سے ....واہ میرے مالک، تیرے کام....آدمی کی یہی اوقات ہے....باپ اور بچے کا رشتہ....کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ....نہیں.....اس لمحے تو خیال بھی نہیں ہوتا....اگر یہ خیال آجائے کہ دونوں کے بیچ بیٹی یا بیٹا...تو خدا کی قسم آدمی شرم سے پانی پانی ہو جائے...خیال سے یاد آیا....اس لمحے، صرف اسی لمحے کا خیال تھوڑی ہوتا ہے.... ہاں شروع شروع میں کوئی خیال ہی نہیں آتا تھا، لگتا تھا کھوپڑی میں سوچنے والی مشین ہے ہی نہیں....پھر دو ایک ماہ بعد یہ مشین چلنا شروع ہوئی...جسم ایک جگہ مصروف اور مشین دوسری جگہ....ماسٹر اسمٰعیل کیا یہ سچ نہیں کہ تم ہانپ یہاں رہے ہوتے تھے، مگر دھیان کسی اور کی طرف ہوتا تھا؟ ....ہونہہ....تو کیا اس کا دھیان بھی کسی اور کی طرف ہوتا تھا....اللہ، کتنا ظلم....کتنا چھل ہے...خود میری بانہوں میں اور دھیان کسی اور کا....اولاد حرامی نہیں ہوگی تو اور کیا؟....اللہ ....قیامت کیوں نہیں آجاتی....مرد کی بات اور ہے...وہ سارا دن باہر دھکے کھاتا ہے، اس لیے اسے نماز میں بھی طرح طرح کے خیال ستاتے رہتے ہیں، مگر عورت تو کہیں نہیں جاتی، پھر اس کا دھیان....اسی لیے تو میں نے نوکری چھڑوا دی تھی.... باہر جاتی رہتی تو جانے کس کس کو دیکھ کر اس کا دھیان کرتی...یاد آیا....چھوٹی چاچی مجھ سے کوئی آٹھ دس سال بڑی تھی....سماعیلے میں چاہتی ہوں میرا بیٹا تیری شکل صورت کا ہو....وہ ہر وقت میرا چہرہ دیکھتی رہتی اور میرے ماتھے پر چومتی ہوئی مجھے دعائیں دیتی تھی....اس کا بیٹا واقعی میرا چھوٹا بھائی لگتا ہے....عورت کے دھیان میں اتنی طاقت !!...شیماں کس کا دھیان لاتی رہی ہے....اگر دھیان سے بچے کی صورت پر اثر پڑ سکتا ہے تو ....آدھا باپ وہ بھی ہوتا ہے؟...میں آدھا باپ ہوں؟.....ماں پوری ہوتی ہے.... پر باپ آدھا بھی ہو سکتا ہے؟....اللہ...مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں آدھا باپ بھی ہوں کہ نہیں....بچے کو باپ دینے کا سارا اختیار عورت کے پاس کیوں ہے؟....قدرت مرد کو اندھیرے میں کیوں رکھتی ہے؟....نہیں، قدرت نہیں، عورت رکھتی ہے....وہ قدرت کا نام لینے ہی سے ڈر گیا تھا۔ اچانک وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، اور ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر سکول سے باہر

کھیتوں کی طرف چل پڑا، اور ایک پگڈنڈی پر ہولیا۔ اس کا دل خوف سے بھرا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اپنی ساری طاقت بروئے کار لا کر بھاگے۔ اس دنیا سے کہیں دور نکل جائے۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ آہستہ آہستہ شمال کی طرف چلنے لگا۔ شمال کی جانب دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کسی انسان پر کسی بھی طرح کی ذمہ داری ڈالنا کتنا آسان ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر قدرت پر ذمہ داری...نہیں... یہ گستاخی ہوگی...نہیں یہ گناہ ہوگا....اس کے ذہن میں قدرت کا مطلب خدا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس معاملے میں خدا کا ذکر گناہ ہے۔ پانی کی کھال کو ڈگ بھر کر عبور کرتے ہوئے، اسے گناہ کا خیال آیا، اور اپنے ساتھ خوف کی ایک لہر لے کر آیا، مگر وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکا کہ وہ خدا کے ڈر کی وجہ سے، اس معاملے میں اس کا ذکر نہیں لانا چاہتا تھا، یا اس کے ذہن میں اکرو کا معاملہ ہی گناہ کا تھا، اور اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ گناہ کے ساتھ کہیں بھی خدا کا حوالہ آئے۔ ایسا نہیں کہ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں خدا کا عمل دخل نہیں دیکھتا تھا۔ وہ خدا کے بغیر اپنا اور اپنی چھوٹی سی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، سچ تو یہ ہے کہ ایسا سوچنے سے بھی وہ ڈرتا تھا، مگر وہ اس بات سے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ غلطی سے شیماں کے گناہ کو.....اسے اکرو کو شیماں کا گناہ کہنے میں عار نہیں تھی.....خدا کی رضا نہ سمجھ لے۔ اس نے جلدی جلدی توبہ کی۔ اچانک قدرت ....اور خدا کا خیال، اسے نئی مصیبت میں ڈال گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک بار کسی بات میں خدا کا ذکر آجائے تو اسے خارج کرنا ممکن نہیں رہتا۔ خدا کو کسی بات میں سے خارج کرنے کا خیال ہی اسے سخت کافرانہ محسوس ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ اس مصیبت سے نکل سکتا ہے۔ ہاں یہ سب خدا کی مرضی تھی۔ نہ نہ، توبہ توبہ، حرامی بچے خدا کی مرضی نہیں ہو سکتے...لیکن خدا کی مرضی کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا، پھر بچہ بننا...ایک عورت خود.....نعوذ باللہ...اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس نے کسی نامعلوم طاقت ور جذبے کے تحت، اچانک ایک کھیت کی مینڈھ پر سر سجدے میں گرا دیا، اور پورے خلوص سے استغفار کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

اس کی غیر موجودگی میں بچے کھیل رہے تھے یا لڑ رہے تھے۔ خلاف معمول اس نے انھیں گالی نہیں دی۔ انھیں، ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ چائے کا ایک اور کپ تھرموس سے انڈیلا۔ یا اللہ، مجھے معاف کرنا۔ چائے سے لاچی کی خوشبو کے ساتھ گاڑھے پن کی ذرا سی ناگوار باس آ رہی تھی، مگر اسے لگا

کہ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے، وہ اپنے خیالات میں گم رہ سکتا ہے۔ اس نے پندرہ سال پہلے کا ایک بھولا بسرا لمحہ یاد کیا۔ اسے پرائمری سکول میں استاد بھرتی ہوئے پانچواں سال تھا۔ دو سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا، اس نے کبھی باپ بننے کی خواہش نہیں کی تھی۔ باپ بننا کون سا تیر مارنا ہے، اسے اکثر خیال آتا۔ باپ نہ بن کر آدمی کون سا تیر مار لیتا ہے۔ اس کے ساتھی استاد نے ایک بار کہا تھا۔ ہاں، صحیح کہا، آپ نے، خود آدمی ہو کر کون سا تیر مارتے ہیں ہم۔ تم تو فلسفی ہوتے جا رہے ہو شیخ صاحب! ساتھی استاد نے تبصرہ کیا تھا۔ اسے ان لوگوں پر حیرت ہوتی تھی، جو شادی کے اگلے مہینے ہی میں باپ بننے کی خبر سننے کے منتظر رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ شاید اگست کا مہینہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک دن پہلے بارش ہوئی تھی، اور ایسا حبس تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ گاؤں کی دائی، اپنی بڑی بہو کے ساتھ، صبح سے ان کے گھر میں تھی۔ دوپہر کو ڈسپنسر نے شیماں کو گلوکوز کی بوتل لگا دی تھی۔ چار یا پانچ کا ٹائم ہوگا، جب اسے بتایا گیا کہ بیٹا ہوا ہے۔ اسے دیکھنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ نماز پڑھنے مسجد چلا گیا تھا۔ واپسی پر اس نے بچے کو دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا جب بچے کو پہلی بار روتے سنا تھا، تب اسے لگا کہ وہ باپ بن گیا ہے۔ کوئی روتا ہوا بچہ تمھاری گود میں ڈالتا ہے تو تمھیں علم ہوتا ہے کہ تم باپ ہو۔ ماں ہونا، اور بات ہے۔ ماں کو کوئی اور نہیں بتاتا کہ تم ماں ہو۔ اس کا جسم اسے بتاتا ہے کہ وہ ماں ہے۔ جسم سے بڑی گواہی کیا ہو سکتی ہے؟ اسے ان لوگوں پر حیرت ہوئی جو دلیل کو جسم کی گواہی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بہت سی چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آیا اگست کی ایک سہ پہر کے واقعات یاد کر رہا تھا، یا ان واقعات کو نئے معانی پہنا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے دائی پر ہلکا سا غصہ آیا تھا۔ کیا تو مجھے بتائے گی کہ میں اس بچے کا باپ ہوں؟ اپنی حیثیت تو پہچان، احمق کہیں کی۔ دائی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دانت کچکچائے تھے۔ تو مجھے اس لیے اس بچے کا باپ بتا رہی ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے بچے کو اس جسم سے برآمد ہوتے دیکھا ہے، جس پر مجھے قانوناً اختیار حاصل ہے؟ تف ہے، اس قانونی اختیار پر بھی۔ ایک جسم پر قانونی اختیار، کیا اس جسم پر.... اور اس کے ذہن....اس کے دل پر کسی دوسرے کو مکمل اختیار دے سکتا ہے؟....تو اس لمحے کی گواہی دے سکتی ہے کیا، جب....جب..اس لمحے کی گواہی کون دے سکتا ہے؟ اس کا دل بے بسی کے احساس سے

ڈوبنے لگا۔

اسے یاد آرہا تھا۔ دائی نے کہا تھا ماسٹر تمھیں خوشی نہیں ہوئی۔ وہ ہڑ بڑا گیا تھا، اور جلدی جلدی بچے کے کان میں اذان انڈیلی تھی۔ لے، آج تو مسلمان ہو گیا۔ کم از کم ایک آدمی کو تو میں نے بھی مسلمان کیا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے، تو نے مجھے یہ توفیق دی۔ تجھے بچے سے زیادہ اسے مسلمان بنانے کی خوشی ہوئی ہے؟ دائی نے چوٹ کی، جو شیرینی کی توقع میں کھڑی تھی۔ آج وہ پوری دیانت داری سے اس اوّلین لمحے کو یاد کر رہا تھا کہ جب اس نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا۔ اسے واقعی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ افسوس بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس نے سرے سے کچھ محسوس ہی نہیں کیا تھا، مگر کیا محسوس کیا تھا، اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ خوشی اور دکھ تو یاد رہتے ہیں، پر کسی شے کا آدمی پر اثر ان دونوں سے ہٹ کر بھی تو ہو سکتا ہے۔ یہی تو مصیبت ہے کہ اسے نہ تو سمجھا جا سکتا ہے، نہ اس کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اسے یاد تھا کہ اسے بچے کو دیکھتے ہی لگا تھا کہ..... یہ سب بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو ایک جیسے ہوتے ہیں... کچھ دنوں بعد جب اس کا ناک نقشہ واضح ہوا تو معلوم ہوا کہ.....نہیں، ہر بچے کی اپنی شکل صورت ہوتی ہے، اور تبھی اس کا دل نفرت سے بھر گیا تھا۔ اکرو میرا تخم کیسے ہو سکتا ہے، جب وہ میری طرح ہے ہی نہیں۔ نیا نیا اس نے چلنا شروع کیا تھا۔ اس کا دوست ماسٹر احمد آیا تھا۔ دونوں بیٹھک میں چائے پی رہے تھے۔ اکرو ننگے پاؤں بیٹھک میں آیا تھا۔ ماسٹر احمد نے کہا تھا۔ اسمٰعیل یار اس کی شکل تم پر تو بالکل نہیں۔ اسے یاد آیا۔ اسے لگا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کی بات سرِ عام کہہ دی ہے۔ وہ پہلا لمحہ تھا، جب اس نے اپنے اندر اکرو کے لیے گھناؤنے پن کو محسوس کیا تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ حرامی پتا نہیں کس پر گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ان سب مردوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا تھا، جو اس کے گھر آتے تھے، یا جتنے مرد اس گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ یاد کر رہا تھا۔ اسے سب مرد مجرم نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس حرامی نے میرے گھر جنم لے کر میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔ جلد ہی سب گھر والوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ پہلوٹھی کے بیٹے کے ساتھ باپ کا رویہ، ایک پتھر دل شخص کا ہے۔ شیماں سے کئی بار تو تو میں میں ہو چکی تھی۔ تم اسے اس طرح دھتکارتے ہو، جیسے یہ تمھارا بیٹا نہیں؟ شیماں نے ایک شام اسے کہا تھا، جب اس نے اکرم کو

اس بات پر تھپڑ جڑ دیا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر آیا تھا، اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا، اور اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے کیا پتا یہ کس کا تخم ہے، مگر اپنی ماں کو وہاں موجود پا کر رک گیا تھا۔

آج شیشم تلے چارپائی کو چھاؤں کی طرف کھینچتے ہوئے، وہ اذیت کا زمانہ یاد کر رہا تھا۔ آج اسے لگ رہا تھا کہ جیسے ایک گتھی سلجھنے لگی ہے۔ عورت ہی فساد کی جڑ ہے۔ ہاں عورت، مرد کی دنیا میں فساد پیدا کرتی ہے۔ عورت اس دکھ کی الف بے نہیں جانتی جو مرد کو کسی حرامی بچے کا باپ ہونے سے لاحق ہوتا ہے۔ ماں کے لیے بچے کا جائز ناجائز ہونا، سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں، لیکن باپ ہونے کا مطلب ہی، بچے کا جائز ناجائز ہونا ہے، اور اسی کا علم اگر باپ کو نہ ہو...تو...وہ روح کی ساری گہرائی سے...جس کا پہلا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا...اس اذیت کو محسوس کر رہا تھا جو اس کے باپ ہونے کی بدترین جہالت کی پیدا کردہ تھی۔ شاید وہ اس بدترین جہالت کو بھی سہار جاتا، لیکن اس جہالت کے اندھے کنویں پر طرح طرح کے بھوت منڈلانے لگتے تھے، اور اس کے باپ ہونے کو مسلسل مشکوک بناتے تھے، اور اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے، اسے اس کی جہالت کا طعنہ دیتے تھے، اور اس کے مرد ہونے پر لعنت بھیجتے تھے۔ وہ دیکھتا اچانک یہ سب بھوت ایستادہ ہو گئے ہیں، اور ایک درز میں سے کسی نامعلوم غار میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس منظر کی تاب اس کے حواس میں نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا!۔ وہ دنیا کی سب عورتوں کو قتل کر دے۔ سب عورتیں، مرد کو دھوکا دے سکتی ہیں، اور مرد بے چارہ، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں.....عورت تف ہے تجھ پر، کس کس کا تخم تو قبول کر لیتی ہے...ماسٹر اسمٰعیل کا لرزہ ختم ہو گیا تھا، اور اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ مرد کی بیچارگی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جب وہ اس سے بے خبر کہ کس کا تخم ہے، بچے کو گود لے کر کہتا ہے کہ تو میرا نام روشن کرے گا... صرف عورت جانتی ہے، اس نے کب سر دھویا تھا...مگر وہ بتاتی کب ہے؟ عورت سے زیادہ مکھم کوئی شے نہیں۔ اسے اچانک ایک قصہ یاد آیا۔ کسی پرانی کتاب میں شاید پڑھا تھا، یا کسی نے سنایا تھا۔ ایک عورت تھی۔ پرلے درجے کی چالباز۔ اس نے سہیلی سے شرط لگائی کہ وہ اپنے خاوند کی موجودگی میں اپنے یار سے ہم بستری کرے گی۔ توبہ! پرانے زمانے میں بھی یہ سب تھا، اس نے سوچا۔ اس نے ایک دن بہانہ کیا کہ اس کے پیٹ میں درد ہے۔ خاوند سے کہا کہ بستی کی دائی کو بلا

لائے۔ وہ دائی کو پہلے کہہ چکی تھی کہ اس کے پیچھے پیچھے اس کا یار بھی آئے گا۔ دائی آئی۔ عورت نے خاوند سے کہا کہ تم بھی یہیں رکو، کسی دوا دارو کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ غریب رک گیا۔ دائی نے اسے لٹا کر ایک چادر تان دی۔ سر اور سینہ چادر سے باہر تھا۔ خاوند اس کے سر کے پاس بیٹھا تھا۔ چادر کی دوسری طرف دائی بول رہی تھی، اور یار مصروف کار تھا۔ عورت کسی میٹھے درد سے کراہے جا رہی تھی۔ یہ کہانی یاد کرتے ہوئے، شیخ اسمٰعیل کو لگا کہ اس پر کسی بہت ہی خاص راز کا انکشاف ہوا ہے۔ مسئلہ اکرو نہیں، مسئلہ تُو ہے۔ اگر تُو ٹھیک ہوتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ یہ بات مجھے آج سے پہلے، اتنے سالوں تک کیوں نہیں سوجھی؟ تم نے کبھی، تنہائی میں دومنٹ کے لیے بھی سوچا، اس سے پہلے؟ کہیں دور سے ایک منحنی سی آواز آئی۔ پر وہ ہے کون؟ اس نے فلاسک سے کپ میں مزید چائے انڈیلی۔ میں نے تو نوکری بھی اس طعنے کے بعد چھڑائی تھی کہ سب استانیوں کے یار ہوتے ہیں۔ وہ کون حرامی ہے؟ آخر ان دونوں کے بارے میں آج تک کوئی سن گن کیوں نہ ملی۔ کیا اس نے بھی کوئی چادر تانی تھی، اور میں سرہانے بیٹھا رہا اور وہ کام کرتے چلا بنا۔ اس کا دماغ شدید غصے اور ناقابل برداشت بے بسی سے بھر گیا۔

تم سب حرام کے تخم ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ وہ بلاوجہ ان بچوں پر چلایا، جو پڑھنا وڑھنا چھوڑ کر کھیل رہے تھے، اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا بھی تھے۔ بچے یہ سنتے ہی اپنے بستے اٹھائے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے، اور اس نے بھی پاؤں جوتی میں ڈال دیے۔

☆

شام کو وہ سکول سے سیدھا سائیں کے پاس پہنچا۔ 'شاہ صاحب، تم نے میرا اچھا تماشا بنایا؟' اس نے گلہ کیا۔

تم خود ہی تماشا بننا چاہتے ہو؟

میں نے رازداری کی گزارش کی تھی۔ وہ منمنایا۔

کون سا راز؟ وہ کیسا راز ہے جسے تم اپنے سینے میں سنبھال نہیں سکے، اور دوسروں سے کہتے ہو کہ وہ سنبھالیں۔ تم سب لوگ اپنے راز ہی تو بھرے بازار میں لانے کے لیے مر رہے ہو؟

میں سمجھا نہیں؟

تم نے بتایا تھا کہ تم بچوں کو پڑھاتے ہو۔ خاک پڑھاتے ہو۔ سائیں سے کیا پوچھتے ہو؟ میری بیوی کا یار کون ہے؟ میری بہو کے پیٹ میں کس کا تخم ہے؟ میری بیٹی کو دورے کیوں پڑتے ہیں؟ میرے گھر میں کون تعویذ گاڑتا ہے؟ پہلے بیٹے کے وقت میری بیوی کس کے ساتھ سوئی تھی؟ شادی سے پہلے وہ برقع پہن کر کس کے ساتھ جاتی تھی؟ فلاں کے پاس لوڈی کہاں سے آئی؟ یہ سارے راز ہی تو تم سرعام لانا چاہتے ہو۔ کیا نہیں؟

اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

اتنے میں سائیں نے کہا۔ 'ساوا پتر، گیلی اگ'۔

اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا سائیں نے اکرو کے اصل باپ کا بتا دیا؟

اس کا وہی مطلب ہے جو تم سمجھنا چاہتے ہو؟ سائیں کو تو خود نہیں پتا وہ کیا کہتے ہیں۔ کان کھول کر سنو، سائیں کی باتوں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ میں، تم، سب سائیں کی باتوں کو اپنی مرضی کا مطلب پہناتے ہیں۔ ہم سارا دن یہی تو کام کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی دوسرے کی بات نہیں سنتا، دوسروں کی ہر بات کو اپنی مرضی اور منشا کا مطلب دیتا ہے۔ تم ماسٹر ہو، میرا باپ بھی ماسٹر تھا، اور مجھے بے حد پیار کرتا تھا، اسی کے صدقے تمھیں سب سچ بتا رہا ہوں۔ ویسے بھی کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم نے شہامند سے ایک مہینے کا معاہدہ کیا تھا۔ اس نے تم لوگوں سے جتنے بدلے لینے تھے، لے لیے، تم سے تو خاص بدلہ لیا ہے۔ میں ہر بار کسی ایک جگہ سے جاتے ہوئے کسی معقول آدمی کو سچ بتا کر جایا کرتا ہوں۔ اگر چہ سب سے مشکل کسی بستی میں معقول آدمی کی تلاش ہے۔ جو سب سے کم احمق ہو، میں تو اسی کو معقول سمجھتا ہوں۔ ماسٹر اسمٰعیل کو اپنے احمق ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ دونوں سے وہ خود کو بزدل بھی سمجھ رہا تھا۔ شاہ صاحب نے بات جاری رکھی۔ سائیں اپنی موج میں خدا جانے کیا بات کہتا ہے۔ تم، میں سب اس میں اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں وہ بات کہوں گا، جو تم سننا چاہتے ہو۔ میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں۔ تم سب گدھے ہو۔ اگر تمھیں واقعی شک ہے کہ تمھارے گھر میں کسی اور کا بیٹا ہے تو جاؤ ٹیسٹ ویسٹ کرواؤ۔ سنا ہے، اب ٹیسٹوں سے کسی کی ولدیت کا اسی طرح پتا چل جاتا ہے، جس طرح پیشاب کے ٹیسٹ سے بیماری کا پتا چل جاتا ہے۔ جی مجھے اس ٹیسٹ کا معلوم ہے۔ شاید ڈی این اے ٹیسٹ کہتے ہیں۔ میں نے ٹی وی پر ایک

کہانی دیکھی تھی، جس میں بچہ اپنے اصل والدین سے اس ٹیسٹ کے ذریعے مل گیا تھا۔

پھر یہاں کیوں آئے تھے؟

وہاں اکرو کو ساتھ لے جانا پڑتا، اور اس سے پتا نہیں کیا کیا کہانیاں گھڑی جاتیں۔

وہ کہانیاں تو اب بھی گھڑی گئی ہوں گی؟

شاہ صاحب، خدا کے لیے مجھے یہ بتا دیں کہ میرے اور آپ کے درمیان کی بات کوٹھوں کیسے چڑھی؟

تو سچ سنو۔ دنیا میں کوئی کام مفت نہیں ہوتا۔ ہم یہاں مفت نہیں بیٹھے۔ سمجھے؟

ہونہہ۔ شہامند۔

اب جاؤ یہاں سے۔ میں اس سے زیادہ تم سے بات نہیں کر سکتا۔

پڑساوا پتر، گیلی اگ' کا مطلب؟

تم ماسٹر نہیں گھامڑ ہو۔ سنتے جاؤ۔ اس کا کوئی مطلب نہیں، مگر تم پھر بھی اصرار کرو گے کہ اس کا مطلب تمھیں کوئی بتائے۔ اس آدمی کی بات تم جلدی مان لیتے ہو، جو ذرا سا پراسرار ہو، مطلب یہ کہ تمھاری سمجھ سے ذرا اوپر ہو۔ تم اپنے برابر والے اور چھوٹے کی بات سنتے ہو، نہ مانتے ہو۔ تم سب کو ایک سائیں، اور ایک شاہ صاحب ہر وقت چاہیے۔ مجھے یقین ہے، میں ان دو لفظوں کا جو مطلب بھی بتاؤں گا تم مان جاؤ گے۔ میں اگر ان کا مطلب یہ بتاؤں کہ تم ایک گیلی آگ میں جل رہے ہو، اور تمھارا بیٹا تمھارے چھوٹے بھائی سے ہے جو سبز پتے کی طرح نوجوان ہے، تو تم مان جاؤ گے، اور اس غریب کے جا کر ٹوٹے کر دو گے۔ اگر تم چند دن پہلے آتے تو میں یہی کہتا۔ میرے یہاں بیٹھنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تم آج آخری دن آئے ہو۔ سنو، اس کا مطلب ہے، سبز پتے ہو سکتے ہیں، مگر آگ گیلی نہیں ہو سکتی۔ تمھیں اگر آگ جلانی ہے تو سوکھے پتے جمع کرو۔ دشمن کو مارو، اپنوں کو نہیں۔ اب سمجھے؟

ہونہہ۔ کچھ کچھ۔

جاؤ، وہ کام کرو، جسے ٹھیک سمجھتے ہو۔

ماسٹر اسمٰعیل نے کچھ روپے شاہ صاحب کے ہاتھ پہ رکھے، مصافحہ کیا، اور چلنے لگا۔

رات ہو چکی تھی، اور اس کے گھر کے دروازے کا بلب جل رہا تھا۔ ابھی وہ چند قدم دور تھا کہ اسے کئی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کل رات سے اپنے خیالوں سے باہر نہیں آیا تھا۔ اسے ان آوازوں کے حوالے سے کوئی جستجو نہیں ہوئی۔ اس نے موٹر سائیکل کا ہارن دیا تو اس کا چھوٹا بیٹا گھبرایا ہوا آیا۔ فوراً دروازہ کھولا۔ اندر کئی لوگ جمع تھے۔ اچانک سب چپ ہو گئے۔ سب ماسٹر اسمٰعیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ماسٹر اسمٰعیل، ان سب کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔ چند ثانیوں کا سناٹا، سب کو جان لیوا محسوس ہوا۔ اچانک سب لوگ، ایک طرف ہٹ گئے۔ ماسٹر نے بلب کی روشنی میں دیکھا کہ چارپائی پر اکرو کو گلوکوز کو بوتل لگی ہوئی تھی۔ تم یہی چاہتے تھے ناں۔ شیماں نے چیختے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک صورت حال کی سنگینی کا احساس کرنے سے قاصر رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ اکرم نے گندم والی گولیاں کھالی تھیں۔ اس کے چھوٹے بھائی نے اسے بتایا۔ پھر؟ جیسے وہ کوئی خبر سننے کا منتظر ہو۔ وہ کسی انجانے احساس کے تحت اکرم کی طرف بڑھا۔ وہ نیند اور بے ہوشی کی ملی جلی حالت میں تھا۔ شیماں اس کے سر پر مسلسل ہاتھ پھیرے جا رہی تھی، اور دعائیں مانگے جا رہی تھی۔ اس نے اکرم کے چہرے کو دیکھا۔ پیلا پڑ چکا تھا۔ تھوڑا مختلف محسوس ہوا۔ اس نے آج تک اسے سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

سب انتظار کر رہے ہیں کہ تم آؤ تو اسے سول ہسپتال لے جائیں۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی نے کہا۔

وہ خاموشی سے باہر نکلا۔ دس منٹ بعد شیخ جمیل سے اس کی کار مانگ کر آیا۔

دو دنوں بعد اکرم کی حالت بہتر ہوئی۔ ان دو دنوں میں ماسٹر اسمٰعیل نے ایک لفظ نہیں بولا۔ دونوں دن وہ ہسپتال میں رہا۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹروں کی لکھی گئی دوائیں میڈیکل سٹور سے خرید لاتا۔ زیادہ وقت ہسپتال کی کینٹین پر بیٹھا رہتا، یا او پی ڈی میں پڑے بنچوں پر۔ رات کو ہسپتال کے او پی ڈی کے برآمدے میں، پنکھے تلے لیٹ جاتا۔ وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اسے نیند آتی ہے، یا نہیں۔ اس نے ان دو دنوں میں ساری نمازیں پڑھیں، مگر کوئی دعا نہیں مانگی۔ اس نے گزشتہ چند دنوں میں خاموشی

اور تنہائی کو زندگی کی سب سے بڑی، سب سے گھناؤنی، سب سے اہم حقیقت کے طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر سب یہ سمجھنے لگے کہ وہ نادم ہے۔ شیماں نے اس سے صرف ایک جملہ کہا کہ وہ کپڑے بدلنے گھر چلا جائے۔ وہ اس کے جواب میں بھی چپ رہا۔ چپ رہنے کی وجہ سے، اسے وہ سب باتیں واضح سنائی دینے لگی تھیں، جو پہلے ریل گاڑی سے نظر آنے والے منظروں کی طرح تیزی سے ذہن میں آتیں اور کوئی اثر ڈالے بغیر گزر جاتی تھیں۔ ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں آتا، اگر اکرم مر گیا.....تو.....اس کا ذمہ دار کون ہوگا...اسے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ کوئی اور نہیں۔ وہ۔ میں قاتل کہلاؤں گا...ایک باپ نے اپنے بیٹے کو حرامی سمجھ کر قتل کر ڈالا۔ پورے علاقے میں یہ خبر..میں قاتل، میرا بیٹا حرامی...میں کس کس کا منہ پکڑوں گا.....اسے قبر میں، مَیں اتاروں گا...قاتل قبر کو مٹی دے گا...قاتل قل پڑھوائے گا...قاتل سے لوگ کہیں گے، شیخ صاحب، امر ربی۔ شیخ صاحب سورہ فاتحہ۔ اس نے ان سب باتوں کو کسی ردعمل کے بغیر سنا۔ میں قاتل بن کر بھی، اس کا باپ کہلاؤں گا...اس کا باپ ہونا، میری تقدیر ہے...اور اُس کا قاتل ہونا بھی...نہیں یہ تقدیر نہیں...اگر پندرہ سال گزر گئے تھے تو باقی سال بھی تو گزر سکتے تھے.....تقدیر اٹل ہے...اس کی ولدیت کے خانے میں میرا نام آنا اٹل ہے۔

اکرم کی ممکنہ موت کا سوال خود بہ خود اسے آگے کھینچ کے لے جا رہا تھا۔ وہ ہسپتال کی کینٹین کے درخت کی گھنی چھاؤں میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ آج کے اخبار کے اداریے صفحے کے سب مضامین پڑھ چکا تھا۔ چائے پیتے ہوئے، سوچے چلا جا رہا تھا۔ نہیں، اس کے لیے سوچنے کا لفظ مناسب نہیں۔ سوچنے میں کوشش کا عمل دخل ہے، جب کہ بغیر کسی کوشش کے، اس کے ذہن میں باتیں آتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کا دل اس تقدس سے بھر گیا تھا، جو کچھ بڑی سچائیوں کے ظاہر ہونے سے از خود پیدا ہوتا ہے، اور یہ بڑی سچائیاں ظاہر ہونے کے لیے صرف بڑے لوگوں کا انتخاب نہیں کرتیں، بلکہ یہ کسی شخص کی اوقات کو سرے سے دیکھتی ہی نہیں، صرف کچھ مخصوص حالات کا انتظار کرتی ہیں۔ شیخ اسمٰعیل انھی مخصوص حالات سے گزر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آ رہا تھا کہ...کسی کو مارنے کا حق کس کو ہے.....جس نے پیدا نہیں کیا، وہ مارنے کا حق رکھتا ہے؟.....پھر.....کیا باپ ہونے کا مطلب کسی کو زندگی دینا ہے.....باپ ہونے کا اصل مطلب کیا ہے...زندگی دینا، یا صرف شناخت.....شناخت کون کرے؟

اکرم کی خودکشی کی کوشش نے اس سوال کا زہر نکال دیا تھا، یا اس کی وہ بزدلی ایک نئے رنگ میں لوٹ آئی تھی، جسے وہ پندرہ سالوں سے اکرم سے نفرت کے پردے میں چھپاتا آیا تھا۔ وہ اس بات کو قطعاً نہیں سمجھ سکا کہ کیسے اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کسی کو مارنے کا ارادہ کرنے، اور اسے مرتے ہوئے دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، اتنا بڑا فرق جتنا ایک بھوت کا خیال کرنے اور اسے حقیقت میں سامنے دیکھنے میں ہوتا ہے۔ اب تک اکرم کو صرف بیٹا سمجھتا آیا تھا، اب پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک آدمی بھی ہے۔ آدمی کے طور پر وہ ماں، باپ، بہن، دوست سب رشتوں سے الگ...اور آزاد..ایک وجود ہے۔ آدمی رشتوں کے جال سے باہر بھی وجود رکھتا ہے۔ جس طرح درخت کہیں اگتا ہے، آدمی کو بھی کسی نہ کسی کی کوکھ سے جنم لینا ہوتا ہے۔ کس کوکھ میں کون جنم لیتا ہے، اس کا فیصلہ...بخدا مجھے نہیں معلوم، کون کرتا ہے۔ اس کے دل کے کسی کونے سے آواز آئی۔ کوکھ بنی کس لیے ہے.....جنم دینے کے لیے...کوکھ کے لیے کوئی وجود حرام ہے نہ حلال...وہ صرف وجود ہے...وجود کو ظاہر ہونے کے لیے کوکھ چاہیے...وجود کے لیے کوئی کوکھ حرام ہے نہ حلال...جس طرح درخت کے لیے کوئی مٹی حلال ہے نہ حرام...آدمی اور درخت میں فرق ہی کتنا ہے؟ مٹی اور عورت ایک ہی کام تو کرتے ہیں۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل شیماں کے احترام سے لبریز ہو گیا ہے۔ نہیں، دنیا کی سب عورتوں کے لیے۔ وہ چائے کا چوتھا کپ پیتے ہوئے سوچے چلا جا رہا تھا۔ جنم لینا ہر وجود کا حق ہے۔ یہ حق اسے اس قوت نے دیا ہے، جس کا خیال کرتے ہی، آدمی کا دل بے بسی اور انکسار سے بھر جاتا ہے۔ اس قوت کے عمل میں مداخلت کر کے، اس نے کتنا سنگین جرم کیا، اس کا احساس اسے اب ہو رہا تھا۔ اس قوت کے آگے ماں، باپ اتفاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں یہ اتفاق ہے کہ میں شیخ نعیم کے گھر پیدا ہوا، یہ اتفاق ہے کہ اکرم کی ولدیت کے خانے میں میرا نام لکھا گیا۔ کینٹین پر درخت کے سائے میں کرسی پر بیٹھے، چائے پیتے ہوئے، اسے لگا کہ اکرم، میں، شیماں، اسلم سب درختوں کی طرح بھی ہیں۔ درخت کو کسی پہچان کی ضرورت نہیں۔ اس کے بچپن کی زندگی کا سب سے المناک واقعات صرف دو تھے۔ جب اس کا باپ مرا تھا، اور جب اس درخت کو اس کے چچا نے کاٹ دیا تھا، جس کی شاخوں سے پینگ کی رسی باندھ کر تینوں بہن بھائی جھولا جھولتے تھے، اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باندر کلا کا

کھیل کھیلتا تھا۔ کٹا ہوا درخت، اسے دنیا کا سب سے وحشت ناک منظر محسوس ہوا تھا۔ اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ وہ درخت کو چھاؤں اور پھل کی خصوصیت سے الگ ہو کر دیکھ رہا تھا، اور اس خاموشی اور تنہائی کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر رہا تھا، جو سنگین تھیں، ادھیڑ ڈالنے والی تھیں، روح میں خنجر کی طرح اترتی تھیں، آدمی خود کو لق ودق صحرا میں محسوس کرتا تھا، کبھی کبھی خود کو نوچنے کو بھی جی چاہتا تھا مگر اس کی روح کے کسی آخری منطقے میں اس بات کا یقین بھی ٹمٹمار رہا تھا کہ یہی خاموشی اور تنہائی بدترین جہالت کی اذیت سے نجات دلانے والی بھی ہیں!

ایک ہفتے بعد اپنے گھر میں اس نے اکرم کا زندگی میں پہلی مرتبہ ماتھا چوما، اور خیرات کی۔

■•◆•◆•◆•■

خاک کی مہک

افسانہ نگار بننے سے پہلے کچھ باتوں کا علم تو خیر دور کی بات ہے، اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار بننے سے پہلے کی حالت اور بعد کی صورتِ حال میں وہ شخص فرق کر سکتا ہے، جس نے دو جنم لیے ہوں یا جسے دو قسم کی زندگیاں گزارنے کا تجربہ ہوا ہو۔ مثلاً پہلے مرد رہا ہو، پھر عورت بن کر جینے لگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک لمبے عرصے تک اندھا رہا ہو، پھر اچانک اسے آنکھیں مل گئی ہوں۔ ویسے تو آدمی سے کیڑا بننا بھی دوسری زندگی شروع کرنا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر کچھ بننا ضروری ہو، اور تھوڑا بہت اختیار بھی ہو تو آدمی، کیڑا کیوں بنے، چیل، چکور، چیتا کیوں نہ بنے، تا کہ دنیا کو دنیا سے ذرا ایک چھلانگ کے فاصلے سے تو دیکھ سکے۔ یوں بھی دوسری زندگی چھلانگ کی مانند ہونی چاہیے۔ ایک بات تو میں بھولا ہی جا رہا ہوں۔ دوسری زندگی میں پہلی زندگی کی یاد رہنی چاہیے، تبھی آدمی دو زندگیاں جی سکے گا۔ اس طرح آدمی کو دیکھنے کے لیے چار آنکھیں مل جاتی ہیں۔ اچھے افسانہ لکھنا کے لیے تو دس آنکھیں بھی کم ہیں۔

افسانہ نگار بننے سے پہلے آدمی کو ایک تنکا، تنکا ہی نظر آتا ہے، مطلب یہ کہ اسے نظر ہی نہیں آتا۔ مگر افسانہ نگار بننے کے بعد ایک تنکا، جھاڑ محسوس ہونے لگتا ہے۔ خیر! اتنا تو شاعر بھی جانتے ہیں، مگر یہ بات صرف افسانہ نگار جانتا ہے کہ ایک تنکا اپنے اندر سے کسی عفریت کو برآمد کر سکتا ہے، پھر بغیر پروں کے اڑ سکتا ہے، اور اپنی چونچ میں زمین اٹھا سکتا ہے، اور موج میں آ کر زمین کو کسی کی آنکھ کے سمندر میں غرق کر سکتا ہے۔ خدا گواہ ہے، مجھے اس بات کا پہلے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اب میں جاننے

خاک کی مہک

لگا ہوں کہ کوئی تنکا معمولی نہیں ہوتا، اور یہ سمجھنے لگا ہوں کہ چیزیں معمولی ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا علم معمولی نہیں ہوتا۔ آدمی کو جنگلی جانوروں، اپنے ہم پیشہ لوگوں اور حشر کے روز سے تو ڈرنا ہی چاہیے، اسے گلی کے اس تنکے سے بھی ڈرنا چاہیے، جو اڑ کو آنکھ میں پڑ سکتا ہے، یا پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن میں چبھ سکتا ہے۔ ذرا سوچیے، اگر اس تنکے پر کسی نے اپنا زہر لگا دیا ہو، یا تنکے نے اپنا زہر اپنی نوک پر اتار لیا ہو تو آپ کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اب تنکے ہر جگہ ہیں۔ گلی میں ہیں۔ گھر میں ہیں۔ مسجد میں ہیں۔ کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے۔ آٹھ یا نو سال کا ہوں گا، جب مسجد میں قرآن کا سبق لینا شروع کیا تھا۔ مسجد میں جھاڑو دینا سب بچوں کے لیے لازم تھا۔ استاد جی کہا کرتے تھے۔ جھاڑو دینا سیکھو گے تو دل صاف کرنا بھی سیکھ جاؤ گے۔ اپنا دل یا دوسروں کا، یہ ترغیب تھی یا لالچ یا نصیحت، تب کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی، لیکن یہ بات اتنی دفعہ دہرائی گئی کہ ہمیشہ کے لیے یاد ہو گئی۔ کبھی کبھی جی چاہنے لگتا ہے کہ گھر اور گلی میں جھاڑو دیا کروں، لیکن ڈرتا ہوں۔ ایک دن جھاڑو دیتے ہوئے ایک پرانی صف کا تنکا میری آنکھ میں پڑ گیا تھا۔ مسجد کا مینار ڈولتا محسوس ہوا تھا۔ استاد جی پانی میں عکس کی طرح لرزتے محسوس ہوئے۔ کئی دنوں تک آنکھ لال رہی تھی۔ اماں اپنے دوپٹے کے پلو کی گیند سی بنا کر میری آنکھ پر رکھتی اور پھونک مارتی رہیں۔۔۔ پپوٹے پر میٹھی حرارت کا احساس آج بھی یاد آتا ہے، اور وہ تنکا بھی!

یہ ساری تمہید آپ کو یہ بتانے کے لیے باندھی ہے کہ میں نے دوسری زندگی شروع کی ہے، مگر پہلی زندگی کو بھولا نہیں ہوں۔ میں پہلے ایک مسجد میں امام تھا۔ لوگ کہتے ہیں میں اچانک بدلا ہوں۔ میں کہتا ہوں، بھائیو، یہاں کچھ اچانک نہیں ہوتا۔ زلزلے تک اچانک نہیں آتے۔ ہاں ہمیں خبر اچانک ہوتی ہے۔ بھائیو، ہونے اور اس کی خبر میں بہت فرق اور اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ خبریں، کسی شے کے واقعی ہونے کو مت ڈھونڈیں، ورنہ تمہارا حال بندر یا آج کے ٹی وی اینکروں جیسا ہوگا۔ میرے اندر بھی کافی عرصے سے چیزیں تبدیل ہو رہی تھی، مجھے ذرا ذرا احساس تو تھا، پر خبر، دیر سے ہوئی۔ اگر آپ کو گاؤں کی مسجد کے کسی امام صاحب کی تقریر سننے کا موقع ملا ہو تو آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ انھیں چھوٹی چھوٹی مثالوں سے بڑی بڑی باتیں سمجھانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ خود سے حکایتیں گھڑنے لگتے ہیں، یا پرانی حکایتوں میں پیوند لگانے لگتے ہیں۔ یہ عادت مجھ میں بھی ہے

خاک کی مہک

، اور میرے بدلنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ باقیوں کو اس نے تبدیل کیوں نہ کیا؟

میرے باپ دادا بھی امام مسجد رہے ہیں۔ انھیں بھی یہ عادت تھی، اور ابا کی عادت سے تو اماں کافی چڑتی تھیں۔ جو عورت سالن میں نمک کی مقدار کا خیال نہیں رکھ سکتی، وہ خیر اور شر میں بھی فرق نہیں کر سکتی۔ اماں چڑتیں نہ تو کیا کرتیں۔ ایک دن اماں نے بھی کہہ دیا جو بندہ نمک اور شر میں فرق نہیں کر سکتا، وہ دین اور دنیا میں بھی فرق نہیں کر سکتا۔ ابا زور سے ہنسے تھے۔ شاوش اے بھئی شاوش اے۔ تم تو عالمہ بنتی جا رہی ہو۔ اگر ابا میں یہ عادت، ان کے والد سے آئی تھی، تو ان میں کہاں سے آئی تھی۔ میں نے ایک دفعہ ابا سے پوچھا تھا۔ کہنے لگے، یہ ہمارے پیشے کی ضرورت ہے، جس طرح مچھلی تیرے نہ تو ڈوب مرے۔ مطلب ہم بھوکے مریں۔ ابا نے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ مگر میں نے پھر پوچھا: چھوٹی باتوں میں بڑی اور گہری باتیں چھپی نہیں ہوتیں، ہم صرف اپنی ضرورت کے تحت لوگوں کو دکھاتے ہیں؟ اس بار ابا نے آئنہ دکھایا۔ تم واقعی بھوکے مرنا چاہتے ہو۔ جو جاننا چاہتا ہے، وہ بھوکا مرتا ہے؟ میں نے جرأت کی۔ ابا نے کہا، ہاں۔ جو اس طرح سوچتا ہے، وہ ناشکرا ہوتا ہے۔ ناشکرے کا رزق جلد ختم ہو جاتا ہے۔ انھیں چھیڑنے کو جی چاہا۔ ابا، رزق لکھا ہوتا ہے، یا کمانا ہوتا ہے؟ ابا نے کہا وہی کماؤ گے جو لکھا ہوگا۔ اچھا، میں نے کہا، کمانے کے بعد کیا یہ جاننے کی ضرورت رہتی ہے کہ کیا لکھا تھا؟ پھر، میں یہ کیسے یقین کروں کہ جو کچھ مجھے ملا ہے، وہی لکھا تھا؟ ہو سکتا ہے، لکھا کچھ ہو، مجھے ملا کچھ ہو؟ میں تو کبھی نہیں پڑھ سکتا جو میرے رزق کے بارے میں لکھا گیا ہے، نہ پہلے، نہ بعد میں۔ تم بھوکے مرو گے اور جہنم بھی جاؤ گے۔ ابا جان غصے میں آ گئے۔ لیکن اب میں سنجیدہ تھا۔ ابا مجھے بتائیں، جہنم صرف سوال کرنے والوں کے لیے ہے، یا گناہ گاروں کے لیے ہے؟ جس طرح کے سوال تم کرتے ہو، اس کے بعد کیا کسی اور گناہ کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ ابا بھڑک گئے تھے۔ ابا اگر ایسا ہی ہے تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں، وہ ہے جس نے میری کھوپڑی خالی نہیں چھوڑی۔ اگر رزق پہلے لکھا ہے تو جہنم بھی پہلے لکھ دیا گیا ہوگا۔ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ ابا کا غصہ ذرا کم ہوا، لیکن میری اس بات پر پھر بڑھ گیا۔ میرا جی چاہتا ہے، میں اس دنیا کے تختہ سیاہ پر لکھی ساری تحریریں مٹا دوں اور ہر آدمی کو یہ حق ہو کہ وہ جو چاہے

خاک کی مہک

لکھے۔ یہاں تک کہ اپنی سزا بھی خود لکھے۔ تمھاری سزا یہ ہے کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ابا نے حکم دیا۔ مگر ابا، یہ سزا تو.... ہاں، ہاں یہ سزا میں نے لکھی ہے، میں تمھارا باپ ہوں، اور لکھ سکتا ہوں۔ کل تم کہو گے، آدمی پہلے باپ کا نام لکھے.... آگے وہ رک گئے اور میں ان کی تجویز کردہ سزا کے مطابق گھر سے باہر آ گیا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ چیزیں تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں۔ میرے اور ابا کے تعلق، اور اس تعلق سے جڑی بہت سی چیزوں سمیت۔

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا، جب مجھے تبدیلی کی خبر ہو گئی، اور میں نے دوسری زندگی جینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی پیشی ابا کے حضور ہوئی۔ امامت کیوں چھوڑی؟ مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ تم اپنی روزی پر لات مارو گے، لیکن اتنی جلدی، اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ابھی تمھاری اولاد نہیں، کل بچوں کی فوج ہو گی تو 'پے نے' (بھکاری) بن جاؤ گے؟ پھر خدا کو کیا جواب دو گے؟ میں چپ رہا۔ وہ اور ناراض ہوئے۔ میں اس تبدیلی کی وجہ کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ سب میرے اندر، اس گہری سطح پر رونما ہوا تھا کہ، اس سے پہلے خود مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے اندر ایسی گہرائی بھی موجود ہے۔ یہ عجب گہرائی تھی، یہ اپنے ساتھ ایک نئی طرح کا احساس بھی لائی تھی۔ مجھے لگا کہ ایک پرائیویٹ قسم کا کوئی کمرہ ہے، جو کسی پراسرار معمار نے راتوں رات، میرے اندر کھڑا کر دیا ہے۔ میں اس سے پہلے واقف ہی نہیں تھا کہ میری زندگی میں کوئی پرائیویٹ جگہ ہو گی، جس کی خبر صرف مجھی کو ہو گی۔ میں ابا کو یہ سب کیسے بتاتا، اور وہ کیوں کر میری بات پر یقین کرتے۔ میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں کسی کے سامنے اپنا دفاع نہیں کرنا چاہتا تھا، ابا کے سامنے بھی نہیں۔ انھوں نے گھر میں حکم جاری کر دیا کہ میرا کھانا پینا بند کر دیا جائے۔ اماں نے ابا کے حکم کی پروا نہیں کی۔

میں ابا کو نہیں سمجھا سکتا تھا کہ ہم اپنے اندر ہر وقت دوسروں سے لڑ جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ جھگڑنا شاید مناسب لفظ نہیں، ہم دوسروں کے آگے اپنا دفاع کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے تب تک اونچا اونچا بولتے رہتے ہیں، اور ہمیں بے چین رکھتے ہیں، جب تک ان کے آگے کوئی ایسی دلیل نہیں رکھتے، جس پر وہ اور ہم دونوں متفق ہوں۔ یہ اتفاق ہی تو مشکل ہے۔ اوّل تو آسانی سے اتفاق نہیں ہوتا، اور اگر ہو جائے تو کچھ معلوم نہیں کہ کب تک قائم رہے۔ اس طرح مسلسل جھگڑا رہتا ہے، اور

خاک کی مہک

دفاع کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنا دفاع پسند نہیں۔

رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بھی کھلا کہ دنیا کا مشکل کام دفاع کرنا ہے۔ اپنا دفاع کرنا تو گویا جنگل میں راستہ گم کرنا ہے۔ کبھی اس طرف، کبھی اس طرف، بس چلتے رہیں، اس امید میں کہ جنگل سے نکل آئیں گے۔ میری بات کی ہر وہ آدمی تائید کرے گا، جسے اپنے دفاع سے سابقہ پڑا ہے کہ دفاع میں آدمی مسلسل بھٹکتا ہے، جیسے بھول بھلیاں میں گم ہو گیا ہو۔ کبھی اِس گلی، کبھی اُس گلی۔ ہر بار ایک نئی دلیل گھڑتا ہے، اور ایک نیا راستہ پکڑتا ہے۔ ویسے بھی اپنا دفاع کرنا، گویا پہلے قبول کرنا ہے کہ آدمی نے ایک ایسا کام کیا ہے، جو دوسروں کی نظر میں غلط ہے۔ دوسرے تو خوش ہی اس بات کے ہوتے ہیں کہ آپ نے غلط کام کیے ہیں۔ جوں ہی کوئی شخص دفاع کے لیے زبان کھولتا ہے، وہ سامنے والوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کچھ قانونی اور اخلاقی فیصلے کر سکتے ہیں۔ میں منبر سے اٹھ کر اس میز تک آ گیا ہوں، بلکہ اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ میری اس چھوٹی سی دنیا پر کسی کو قانونی یا اخلاقی اختیار کا دعویٰ کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ مجھے لگا، میں جیسے ہی اپنے دفاع میں کوئی بات کہوں گا، سامنے والے آدمی کے اس اختیار کو تسلیم کروں گا کہ وہ میری میز پر پڑے میرے اپنے کاغذات کا معائنہ کر سکتا ہے۔ سوچیے: اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی ہو سکتی ہے! جس شخص کو آپ اپنے ذاتی کاغذات تک رسائی دیتے ہیں، اسے اس بات سے کیسے روک سکتے ہیں کہ وہ ان میں کوئی ردوبدل نہ کرے، اور چاہے تو وہیں کھڑے کھڑے آپ کے خلاف کوئی مقدمہ تیار نہ کرے۔ کسی کے ذاتی کاغذ کا پرزہ بھی مل جائے تو، میں نے سنا ہے، لوگوں کی نیت میں فتور آ جاتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا قصے کہانیاں گھڑتے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ماسٹر ظہور رہتے ہیں۔ ان کی دسویں جماعت میں پڑھنے والی بیٹی کا سکول بیگ، سکول وین میں رہ گیا۔ اگلے دن بیگ مل گیا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ کہانی گھر گھر پھیل گئی کہ اس کا وین ڈرائیور سے چکر ہے۔ اس کا بیگ اس کی سہیلی گھر لے گئی تھی کہ آخر میں وین سے وہی اتری تھی۔ کسی کاپی میں ڈرائیور کا موبائل نمبر لکھا مل گیا۔ ماسٹر ظہور نے بیٹی کو گھر بٹھا دیا ہے۔ اس کی بیٹی نہیں پوچھ سکی کہ کس حیثیت میں اس کی ذاتی کاپی کو کھولا گیا، اور کیا نمبر لکھنے کا وہی مطلب ہے، جو ذاتی تحریر پڑھنے والے نے لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے لکھے ہوئے

لفظ کی طاقت کو بھی دریافت کیا ہے۔ ایک لفظ، صرف ایک لفظ کسی کی تقدیر الٹا سکتا ہے! ایک سکول کی طالبہ کو گھر بٹھا سکتا ہے۔ میں تو اس طاقت سے ڈر گیا ہوں۔ خالی صفحے پر لکھنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچتا ہوں۔

ذاتی کاغذات تک رسائی دینے کی حماقت کون کرتا ہے، یا کون مجبور ہوتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ بھلکڑ، مجرم، یا وہی جو دوسروں سے ڈرتا ہے، یا خود کو بزدل سمجھتا ہے۔ میں ابھی اپنے مجرم ہونے نہ ہونے کے حوالے سے کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنا چاہتا، کیوں کہ اس کا مطلب اپنا دفاع ہوگا، اور میں اس جنگل میں بھٹکنا نہیں چاہتا۔ میں تھوڑا بہت بھلکڑ ہوں، اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی عار نہیں کہ میں بزدل بھی ہوں۔ میں اس میز پر لکھا گیا اپنا افسانہ اُس منبر پر بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا، حالاں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی دن ایسا بھی آئے۔ مثلاً اتوار کا دن ہو، میں ظہر سے پہلے مسجد میں پورے گاؤں کے لوگوں کو بلاؤں۔ حضرات، آج صرف میری خاطر آئیے۔ میں تمھیں خطبے کی مانند اپنا افسانہ سنانا چاہتا ہوں، جسے میں نے اپنے اندر کے حجرے میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ میں وہی ہوں جو تمھیں عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی مثالوں کی صورت کہانیاں سنا تا رہا ہوں۔ مگر میں تو اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اس خواہش کا اظہار بھی ان کے سامنے کر دیا تو وہ کم سے کم جو سزا دیں گے، وہ اس مسجد میں ہمیشہ کے لیے میرا داخلہ بند ہوگا۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ ایسے حالات پیدا ہوں کہ خدا کے گھر میں کسی کے داخلے کا فیصلہ، خدا کے بندے کرنے لگیں۔ بندوں نے پہلے ہی کتنے ہی خدائی اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے ہیں، اور خدا کو اس کے منصب سے معزول سمجھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں اتنا اندازہ تو کر چکا ہوں کہ گاؤں کے لوگ اب مجھے اپنوں میں سمجھتے ہی نہیں۔ میری ساری الجھنوں کی جڑ بھی یہی ہے۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا کہ اسی گاؤں کا یہ افسانہ، ان کی دنیا سے باہر کی چیز کیسے ہو گیا؟

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں جس دفاع سے بچنے کی خاطر ایک اپنا چھوٹا موٹا فلسفہ گھڑ رہا تھا، وہ بھی دفاع ہی تھا۔ جس جنگل میں داخل ہونے سے ڈر رہا تھا، اپنے فلسفے ہی سے اسے اگا رہا تھا۔ میری صورت حال سنگین ہو چکی تھی۔ اس بات کی صداقت کو میں نے آگے کے واقعات سے پہچانا۔ لیکن

خاک کی مہک

اتنا بہ ہر حال واضح ہو گیا کہ مجھے اندر اور باہر بھی کٹہرے میں کھڑے ہونا ہے، اور باہر کا کٹہرا، الامان، الحفیظ! یہاں..... یہاں سے مراد میرا گاؤں ہے، میں نے دنیا دیکھی ہی کب ہے؟ دنیا تو تب دیکھوں، جب اپنے گاؤں کو پوری طرح دیکھ لوں... خیر، یہاں دلیل ہر اس شخص کی چلتی ہے، یا وہ چلا لیتا ہے، جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس دلیل ہے۔ دلیل کوئی باہر کی چیز تو ہے نہیں۔ بس خیال میں فرض کر لیا، اور لیجیے دلیل حاضر! انسان کا دماغ جتنا، دوسروں کی جواب طلبی میں چلتا ہے، اتنا کسی اور بات میں نہیں۔ اس لیے یہاں ہر شخص دلیل کی درانتی لیے پھرتا ہے، اور مجھے کہیں بھی دیکھ لے، درانتی نکال لیتا ہے۔ کسی کے پاس صرف درانتی ہے، اور کسی کے پاس تگڑے بازو بھی ہیں، اور کوئی اللہ رسول کی قسم کھا کر دلیل دیتا ہے، اور کوئی دلیل کے ساتھ نئی گاڑی اور نئی نوکری کا پیوند لگا تا ہے۔ پہلے پہل تو میں نے یہ سوچا کہ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے کہ کوئی خطیب بنے یا افسانہ نگار۔ پھر اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے کہ میں خطیب بنا رہوں یا کچھ اور۔ لیکن جلد ہی محسوس ہو گیا کہ ان دونوں باتوں سے ایک ہی بات ظاہر ہے: نری جہالت، کچھ سنگین سچائیوں کے سلسلے میں۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں نے دنیا نہیں چھوڑی، رشتوں کو نہیں چھوڑا، ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام اختیار کر لیا ہے، مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کوئی عظیم معاہدہ کر رکھا تھا، جسے توڑ دیا ہے۔ یہ مجھے لوگوں کی درانتیوں نے بتایا، جو اس طرح لوگوں نے نکال لی ہیں، جس طرح گندم کی فصل کاٹنے کے لیے ہاڑ میں نکال لیتے ہیں، اور غلام لوہار سے تیز کروا لیتے ہیں۔ کچھ نے تو ان پر زہر بھی لگا لیا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا، پندرھویں صدی میں زہر باہر سے لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

میں گلی سے گزروں، نماز پڑھنے جاؤں، گھر میں کوئی ملنے آئے، ایک ہی سوال مجھ سے کیا جاتا ہے۔ میں چپ رہتا ہوں۔

میرے بارے میں لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں میں نے پورا قرآن حفظ نہیں کیا تھا، اس لیے امامت چھوڑنی پڑی۔ یہ بات میرے بعد میں آنے والے حضرت کرتے ہیں۔ مجھے برا نہیں لگتا۔ ایک دن صبح کی نماز کی امامت کرتے ہوئے، میں ایک سورہ کی آیت بھول گیا، جس کا لقمہ حافظ افضل نے دیا۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ فقط حافظے کی خطا کا مسئلہ نہیں

تھا۔ نماز سے کچھ دیر پہلے میں کچھ لوگوں کے ساتھ، مسجد میں بیٹھا تھا۔ رضا نام کا ایک آدمی تھا۔ کریانے کی دکان کھول رکھی ہے۔ پچاس سال کا ہوگا۔ پچھلے بیس سال سے خونی بواسیر کا مریض تھا۔ کہنے لگا، حافظ صاحب، دعا کیجیے، اس موذی مرض سے جان چھوٹ جائے، جینا عذاب بنا ہوا ہے۔ حکیموں کے ٹیکے، پھکیاں، ڈاکٹروں کی گولیاں، انجکشن، پیروں فقیروں کے تعویذ، ٹونے سب کر چکا ہوں۔ میں نے بے ساختہ کہا، اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ توبہ استغفار کیا کرو۔ اتنے میں فجر کی جماعت کا وقت ہوگیا۔ حافظ افضل نے تکبیر پڑھی۔ دوسری رکعت میں الحمد کے بعد مجھے رضا کا خیال آیا، اور اپنی بات یاد آئی۔ کیا میں نے اسے گناہ گار سمجھ کر توبہ استغفار کے لیے کہا۔ میں اس کے لیے دعائیہ کلمہ بھی تو کہہ سکتا تھا۔ تاسف کا ایک بھاری لمحہ اچانک وارد ہوا۔ سورہ لہب کی تیسری آیت پر پہنچتے پہنچتے میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ میں رک گیا۔ یہ ایک سیکنڈ کا نصف بھی نہیں ہوگا۔ آپ امامت کے مصلیٰ پر کھڑے ہیں۔ آپ کی اقتدا میں بیس تیس لوگ ہاتھ باندھے رکوع وجود کے منتظر ہیں، اور آپ قرآن کی آیت بھول جائیں۔ یہ بھول، چلتے چلتے راستہ بھولنے جیسی نہیں تھی؛ یہ اس طرح کا بھی بھولنا نہیں تھا کہ کسی کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ بھول گئے ہوں کس سطر کو آپ پڑھ رہے تھے۔ آپ کو کسی نے دوا لانے کے لیے کہا ہے، اور آپ میڈیکل سٹور پر پہنچ کر دوا کا نام بھول گئے ہیں، یہ اس کی طرح کی بھول بھی نہیں تھی۔ آپ دریا میں کشتی پر بیس تیس لوگوں کو بٹھا کر کنارے پر لے جا رہے ہیں، اچانک آپ کو کشتی چلانے کا فن بھول جائے، اور آگے ایک بڑا گرداب ہو۔ نہیں یہ اس سے بھی سوا کوئی حالت تھی۔ یہ کوئی الجھن بھی نہیں تھی۔ یہ اچانک دھاوا کرنے والی سیاہی تھی۔ ایک مکمل خالی پن تھا۔ مقدس آیات کے ذہن سے غائب ہونے سے، معاً واقع ہونے والا خالی پن تھا۔ مجھے اس کا قطعی تجربہ نہیں تھا، اس لیے اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ سیاہ خالی پن میں خوف، شرم، بے بسی حشرات بن کر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے لگا، میرا گلا بند ہو رہا ہے۔ اچانک حافظ افضل نے لقمہ دیا: سیصلیٰ نارا... سیاہ خالی پن دور ہوگیا۔ سیصلیٰ نارا ذات لھب۔ وامراتہ حمالۃ الحطب... جوں ہی رکوع میں گیا تو جس آیت کو میں بھولا تھا، اس کا مطلب میرے ذہن میں ایک دھماکے سے آیا: وہ جلدی اس آگ میں داخل ہو جائے گا، جس کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ میں کانپ گیا۔ فروری کی صبح تھی۔ میں نے سلام پھیرا تو ریڑھ کی ہڈی پر پسینہ تھا۔

خاک کی مہک

مجھے اس بات کا اندازہ پہلے سال ہی ہوگیا تھا کہ جس طرح گاؤں کے دو کمپوڈروں میں، جو دونوں ڈاکٹر کہلاتے ہیں، روز جھگڑے ہوتے ہیں، اماموں میں بھی جھگڑے ہوتے ہیں۔ گاؤں کے دونوں ڈاکٹروں کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے کے ہاتھوں کوئی مریض جان سے گزرے اور اس کی ہٹی بند ہو۔ مسجد کے امام بنے رہنے میں بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہر مدرسے میں سیکڑوں حفاظ تیار ہو رہے ہیں۔ انھیں کسی نہ کسی مسجد ہی میں روزگار ملنا ہے۔ نئی مسجد بنانا اب آسان نہیں رہا۔ پرانی مسجدوں کے امام مرتے دم تک چمٹے رہتے ہیں۔ اس لیے نئے حفاظ مختلف مسجدوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پہلے کچھ دن اذان دیتے ہیں، پھر بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں، اور کسی دن امام کے مصلیٰ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام کا مصلیٰ اور بادشاہ کا تخت ایک جیسے ہیں۔ ایک بار پاؤں سے جدا ہوا تو سدا کے لیے گیا۔ میں جب تک رہا، حافظ افضل کو امام کے مصلیٰ پر کھڑے نہیں ہونے دیا۔ البتہ وہ میرے ساتھ جنازے پڑھانے لگا۔ قلوں پر میرے ساتھ جانے لگا۔ مجھ سے پہلے تلاوت کرنے لگا۔ نعت پڑھنے لگا۔ کسی کا بچہ ہوا تو اس کے کان میں اذان دینے چلا گیا۔ اس کی کچھ نہ کچھ آمدن ہونے لگی۔ میں امامت تو کر لیتا تھا، جنازہ بھی پڑھا لیا کرتا تھا مگر میت کو غسل دینا، اور قلوں کے پھل، مٹھائی، دودھ گھر لاتے ہوئے کوفت ہوتی تھی، اس لیے حافظ افضل مجھے خدا کا فضل لگنے لگا۔ اس رات عشا کی نماز کے لیے میں نے خود اسے امامت کا مصلیٰ دے دیا۔

مسجد سے میرے گھر کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگتے ہیں۔ میں نے یہ اہم ترین فیصلہ یہی فاصلہ طے کرتے ہوئے کیا۔ میں ٹھیک ٹھیک بتا نہیں سکتا کہ میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا تھا، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا، یا میں نے خوب سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی بات بھی درست نہیں لگتی۔ تین طرف دیواریں ہوں، اور چوتھی سمت گڑھا ہو تو تین میں سے کسی ایک دیوار سے ٹکرانا، کتنا سوچا سمجھا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ میں مغرب کی نماز پڑھانے کے بعد مسجد سے نکلا۔ سب نمازی چلے گئے تھے۔ حفظ کرنے والے بچے بھی کھانا کھانے چلے گئے تھے۔ میں بھی کھانے کے خیال سے نکلا۔ کھانے کا خیال اس لیے بھی آیا کہ اس روز میں بکرے کا گوشت لایا تھا۔ اب آپ سے کیا پردہ، وہ بکرا گاؤں کے حکیم

خاک کی مہک

صاحب نے صدقہ کیا تھا۔اس کے اپنے بیٹے کا یرقان ڈاکٹری علاج سے ٹھیک ہوا تھا۔بکرے کا گوشت ٹھہر ٹھہر کے کھایا جائے تو لذیذ محسوس ہوتا ہے۔یہ لذت صرف گوشت کی نہیں ہوتی۔خیال تھا، کھانا ختم کروں گا تو اتنے میں عشا کی اذان کا وقت ہو جائے گا، پھر مسجد میں آجاؤں گا۔میں مسجد سے نکل کر اس کی مشرقی دیوار کے ساتھ چلنے لگا۔جہاں یہ دیوار ختم ہوتی ہے، وہیں سے گاؤں کی مرکزی گلی شروع ہوتی ہے۔مسجد کی اسی دیوار کے کونے کے ساتھ ہی گاؤں کا واحد ٹرانسفارمر ہے۔میں ابھی اس تک نہیں پہنچا تھا۔بجلی بند تھی۔چاند کی ساتویں آٹھویں تھی۔مسجد میں یو پی ایس تھا، مگر باہر کا بلب صرف بجلی سے جلتا تھا۔اندھیرا تھا۔کیا ہوا کہ اچانک ایک شخص میرے آگے آیا۔میں نے سمجھا گاؤں ہی کا کوئی شخص ہے جسے میں اندھیرے میں نہیں پہچان رہا۔میں نے السلام علیکم کہا اور آگے قدم بڑھایا۔جواب نہیں ملا۔ابھی میں نے پہلا قدم مکمل ہی نہیں کیا تھا کہ مجھے لگا کہ وہ تو عورت ہے۔مجھے سلام کہنے پر ندامت ہوئی۔میں نے سوچا، اگر معافی مانگی، اور کسی نے میری آواز سن لی تو پتا نہیں کیا کیا باتیں بنائے گا۔ابھی دوسرا قدم مکمل نہیں کیا تو لگا وہ عورت نہیں، بھیڑیے سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔جی ڈر سے بھر گیا۔میرے تلووں میں کسی نے کیلیں ٹھونک دیں۔کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔مسجد غائب، ٹرانسفارمر غائب، میں سرکنڈوں کے جنگل میں ہوں۔سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔یہ بات جیسے میں نے کبھی سوچی ہی نہیں تھی کہ میں بعد از نماز مغرب، مسجد سے بکرے کے گوشت کا سالن کھانے جا رہا تھا۔مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کب سے اور کیوں اس جنگل میں ہوں۔وقت جیسے ختم ہو گیا تھا۔میں ایک اور دنیا میں آگیا تھا۔وہ بھیڑیا تھا، رات تھی، جنگل تھا، اور میں۔اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ہاں ایک اور چیز بھی تھی۔ڈر تھا اور کیلیں تھیں۔یہ ڈر بھیڑیے اور میرے درمیان تھا۔اس نے ہم دونوں کو اپنی اپنی جگہوں پر روک رکھا تھا۔ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا کہ جو پہلے بھاگے گا، وہی جان سے جائے گا۔جان سے جانے اور معاہدہ توڑنے کے ڈر اکٹھے ہو گئے تھے۔اچانک روشنی ہوئی۔میرا سر کھمبے کی سرد سلاخ سے ٹکرایا، اور کیلیں اکھڑ گئیں۔جنگل غائب، بھیڑیا غائب۔وہی ٹرانسفارمر والی گلی کی نکڑ ہے، میں ہوں اور میرے ہونٹ ...اف...خدایا۔ماتھے پر خون رس رہا تھا۔سب سے پہلے میں نے ادھر ادھر دیکھا۔کوئی نہیں تھا۔دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں

خاک کی مہک

سے کوئی گزرا نہیں۔گھر پہنچا۔پہلے غسل کیا، پھر کھانا کھایا۔اس رات عشا کی اذان سلیم نے دی، جو آدھے سے زیادہ قرآن حفظ کر چکا ہے۔عشا کی نماز کے لیے میں خود حافظ افضل سے کہا۔اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔میں نے کہا میرے سر میں شدید درد ہے۔میں نے پہلی بار مسجد میں جھوٹ بولا، لیکن اپنی روح کی مکمل سچائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ میں اب امامت کے مصلّی پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا۔میں نے محسوس کیا کہ جب ہماری روحیں کسی سچائی کا مکمل ادراک کرتی ہیں تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہیں...اتنا ہلکا پھلکا کہ وہ کسی اور دنیا میں چلی جاتی ہیں، جہاں تعلقات کا کوئی بوجھ ان پر نہیں پڑتا۔تب انسانی روح اس خوف سے آزاد ہو جاتی ہے کہ سچائی کتنی کڑی، کتنی اٹل ہے، اور اس کے نتائج کس قدر بھیانک ہیں۔اس لمحے ابا، حضرت عبدالستار اور باقی سب لوگ کسی اور دنیا کے باشندے تھے، اور اس دنیا سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔انھوں نے مجھے اپنی دنیا سے باہر کر دیا۔

میں اپنے فیصلے کے نتائج بھگت رہا ہوں۔

امامت سے دست بردار ہونے کا سبب، ایک اور واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔یہ انوکھا واقعہ ہے۔مجھ سے اس کا تعلق ہے بھی، اور نہیں بھی۔اب تو سوچتا ہوں کہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے، جس سے میرا تعلق نہ ہو۔اب میری حالت، اس بچے جیسی ہے جو ذرا سے کھٹکے سے جاگ گیا ہو، اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف دیکھ رہا ہو۔ہنستا ہو، روتا ہو، اپنا پورا جسم حرکت میں لاتا ہو۔ہمارے گاؤں میں ایک شخص آکر رہنے لگا ہے۔عمر یہی کوئی ساٹھ کے آس پاس ہوگی۔ندیم نام کا یہ شخص کوئی پانچ سال پہلے یہاں آیا تھا۔مسجد کی بغلی گلی کے اختتام پر ارائیوں کا گھر ہے۔دس مرلے کا ہوگا۔اس نے وہ گھر خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔مالک بیچنے پر تیار نہیں تھے۔پوچھا، بھائی کون ہو، اور کیوں یہی گھر خریدنے پر تلے ہو۔کہا، یہ گھر ان کے والد نے پینتالیس سال پہلے بیچا تھا۔کچھ لوگوں کو یاد آ گیا کہ یہیں احمد نام کا ایک ترکھان رہتا تھا، جس کے دو بیٹے تھے۔وہ بیٹوں کو اچھی تعلیم دلانے کے لیے شہر چلا گیا تھا۔اور بھی چند لوگ تھے، جو گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے تھے۔ایک ایک کر کے گاؤں والوں کو یاد آنے لگے۔ندیم اپنے آبائی گھر کو واپس حاصل کرنا چاہتا ہے۔لوگوں نے پوچھا، اب اس گھر میں کیا ہے؟ دیواریں کچی ہیں، صحن کچا ہے، دو سو کے سڑے درخت ہیں اور تین کمرے ہیں، جن کی دیواریں

خاک کی مہک

باہر سے پکی اینٹوں سے بنی ہے اور اندر سے کچی ہیں۔ ارائیوں نے گھر کی قیمت تیس لاکھ بتائی، جو تین گنا زیادہ تھی۔ اس نے ایک ہفتے بعد ادا کر دی۔ رجسٹری ہوئی، اور وہ اکیلا وہاں رہنے لگا۔ ایک کسان نے پوچھا، تیس لاکھ میں وہ تین ایکڑ زرعی زمین خرید سکتا تھا، پھر یہ دس مرلے؟ وہ اس وقت گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ پہلے وہ مسکرایا، پھر پوچھا: زمین کا سب سے قیمتی ٹکڑا کون سا ہے؟ کسان بولا: جسے نہری پانی ملتا ہو۔ اس نے کہا: وہ زمین مہنگی ہو سکتی ہے، قیمتی نہیں۔ کسان کچھ کچھ سمجھتے ہوئے پھر بولا: خانہ کعبہ۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا، کیا تم نے خوابوں میں زمین کے کسی ٹکڑے کو دیکھا ہے؟ کسان پریشان ہو گیا۔ وہ بولا: میں نے پچھلے بیس سالوں میں ہزاروں مرتبہ صرف اس گھر، اس کے صحن اور اس گلی کو خواب میں دیکھا ہے۔ میرے لیے یہ دنیا کا سب سے مقدس ٹکڑا ہے۔

ندیم کبھی چلا جاتا ہے، اور کبھی آ جاتا ہے۔ کبھی اس کے ساتھ اس کے جوان بیٹا بھی آتا ہے، جو ایک آدھ رات رکنے کے بعد چلا جاتا ہے۔ وہ خود کھانا پکاتا ہے۔ گزشتہ سال ایک انوکھی بات سننے میں آئی۔ پہلے وہ کچھ لوگوں کو گھر میں آنے دیتا تھا، مگر اب نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے صحن میں ایک قبر کھودی ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ کبھی قبر کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ آج کل زیادہ وقت مسجد میں گزارتا ہے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ایسا کرنا غلط ہے، موت کے بعد قبر میں سب کو جانا ہے، جیتے جی قبر میں جانا ٹھیک نہیں، لیکن اگر وہ صرف موت کو یاد کرنے کی غرض سے ایسا کرتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ میں نے مدرسے میں ایک اللہ کے ولی کا قصہ سنا تھا کہ وہ موت کو یاد کرنے کے لیے قبر ہی میں عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ندیم سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کا جواب میرے خیال کے بالکل برعکس تھا۔ کہنے لگا، اسی جگہ میری آنول نال گڑی ہے۔ اسی جگہ دفن ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مٹی سے محبت کا نہ تو مطلب آتا تھا، نہ اس کا تجربہ تھا۔ میں اس کی بات نہیں سمجھا، مگر اس کی بات میرے ذہن میں مسلسل گونجتی رہی، اور ایک دن مجھے لگا کہ اس کا تعلق تو مجھ سے بھی ہے۔ کسی اور کی بات دیر تک تھوڑی آپ کے ذہن میں گونج سکتی ہے!

مجھے لگا، میری زندگی میں کسی بہت اہم شے کی کمی ہے۔ میں اب تک دنیا کو جائز ناجائز، غلط صحیح، حلال حرام کے ذریعے سمجھتا آیا تھا۔ سمجھنے کا لفظ میں نے بالکل غلط استعمال کیا ہے۔ میں دنیا پر فیصلے

خاک کی مہک

دیتا آیا تھا، سمجھا بالکل نہیں تھا۔ اب مجھے لگنے لگا تھا کہ ہر فیصلہ مجھے چیزوں سے دور کر دیتا تھا، اور ایک نا محسوس تکبر کے ساتھ بلند بھی۔ کبھی دل میں نفرت بھر دیتا تھا، کبھی شاباش دینے کے جذبات، مگر میں خود کو فاصلے اور اونچائی پر محسوس کرتا تھا۔ یہ فاصلہ میرے اندر رعونت بھر رہا تھا۔ میں جائز اور ناجائز کا فرق رعونت بھرے لہجے میں سنانے لگا تھا، جیسے جائز اور ناجائز کی تصوراتی دنیا پر میرا مکمل اجارہ ہو، میں اس مملکت کا مطلق العنان بادشاہ ہوں۔ کسی کے آگے جواب دہی کا خیال ہی جاتا رہا تھا۔ میری مملکت کے لوگ نیک تھے یا برے۔ کوئی تیسری قسم نہیں تھی۔ نیکوں کو اجر کی خوش خبری اور بروں کو وعید سناتا تھا۔ مجھے یاد ہے گاؤں میں نئی نئی کیبل آئی تھی، میں پہلا شخص تھا جس نے گاؤں والوں کو وعید سنائی تھی کہ ان پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ کچھ دنوں بعد ایک ریٹائرڈ فوجی پر ایک جوان لڑکی کی عصمت دری کا مقدمہ بنا تو میں نے مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ کیبل کا عذاب دیکھ لیا؟ ابھی تو آغاز ہے۔ ایک نوجوان نے کہا کہ فوجی کے گھر میں تو کیبل نہیں لگی۔ میں غصے میں آ گیا اور کہا۔ عذاب آتا ہے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ فوجی مقدمے سے بری ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ اسے اس کے کاروباری شراکت دار نے پھنسایا تھا۔ میں نے سب سے پہلے فیصلہ دیا۔ ابھی خدا کی طرف سے تنبیہ تھی۔ خدا کے بندو باز آ جاؤ مگر میں اپنی رعونت سے باز نہیں آیا۔

آج میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے درجنوں جنازے پڑھائے ہیں، اور میرے سامنے کتنے ہی لوگ مٹی میں چلے گئے، اور ان کے چہروں کا آخری دیدار کرتے ہوئے سیکڑوں لوگ روئے ہیں، دھاڑیں مار مار کر، مگر میری آنکھ میں کبھی نمی بھی نہ آئی۔ میں نے ان سب کی بخشش کی دعا مانگی، اور کبھی کبھی رقت بھی طاری کی، مگر وہ میرے پیشے کی ضرورت تھی۔ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ میں اتنا نیک کیسے ہو گیا کہ ان سب کی بخشش کی درخواست خدا کے آگے رکھ سکتا ہوں۔ کیا جنازے میں شریک سب لوگوں میں، مَیں ہی سب سے زیادہ مقربِ خدا تھا؟ میں کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر سکتا تھا؟ کیا مرنے والے سب ہی گناہگار ہوتے تھے؟ میں نے ایک دن کے بچے سے لے کر سو سال کے بڈھے تک کے جنازے پڑھائے، سب کی بخشش کی دعا کی۔ سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا، اور خود کو ایک بلند جگہ پر، جہاں سے خدا تک میری آواز پہنچ سکتی تھی۔ میں لوگوں کو یقین دلانے میں کامیاب

ہوگیا تھا کہ خدا تک میری آواز پہنچتی ہے۔اس یقین کی وجہ ہی سے وہ میرے ہر دعائیہ کلمے کے بعد آمین آمین کہتے تھے۔ میں لوگوں کے اس یقین کا پھل کھا تا رہا ہوں۔ مرنے والوں کو جنت کے میوے ملے ہوں ،یا نہ ملے ہوں، مرحومین کے لواحقین کی طرف سے میرے گھر پھل فروٹ برابر آتے رہے۔ میں جب بھی مسجد میں کسی کے مرنے کا اعلان کرتا تو مجھے کبھی اپنی موت کا خیال آیا، نہ مرنے والے کے ورثا کے دکھ کا احساس ہوا، میرا دھیان جنازے، قل، چہیوں، پھل فروٹ کی طرف جاتا، اور دل سے خدا کا شکر ادا کرتا کہ وہ بھوکا نہیں مارتا، رزق کی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کرتا رہتا ہے۔ مجھے اس تضاد کا کبھی احساس نہ ہوا کہ میری سانسوں کی آمد ورفت ،دوسروں کی سانسوں کے رکنے پر منحصر ہوگئی تھی۔ میں اپنے لقموں کے لیے، دوسروں کے رزق کے ختم ہوجانے کا منتظر رہنے لگا تھا۔ میں کس عجب دنیا میں تھا، جہاں میرے گھر کا چولھا، دوسروں کے سوگ سے جلتا تھا۔

ندیم کے واقعے نے مجھے سمجھایا کہ دنیا کے ساتھ آدمی کے دو طرح کے رشتے ہیں۔ آدمی دنیا پر فیصلے دیتا ہے، یا اسے سمجھتا ہے۔ فیصلے دے کر وہ بادشاہ بننا چاہتا ہے، اور سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ جس پر وہ فیصلے دیتا ہے، اس سے اتنا ہی دور ہوتا ہے، اور دوری میں آدمی صرف اپنا عکس دیکھتا ہے، یا اپنی خواہشوں کے سائے دیکھتا ہے۔ جس کو وہ جتنا سمجھتا جاتا ہے ،اس کے اتنا ہی قریب آتا جاتا ہے، اور اپنے سایوں سے اتنا ہی دور۔ پہلے میرا خیال تھا کہ کسی کو سمجھنے اور پہچان لینے کے بعد، آدمی اس سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجاتا ہے، پر اب سمجھتا ہوں کہ آدمی، کسی سے اس وقت دور ہوتا ہے، جب وہ سمجھنے کے نام پر، کسی کے بارے میں حکم لگاتا ہے۔ یہ اچھا ہے، وہ برا ہے۔ یہ سمجھنا تھوڑی ہے، یہ تو فیصلہ ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آدمی کسی کے قریب آکر، اس سے ہم آغوش ہوکر، اس پر حکومت کرنے کے خواب نہیں دیکھتا۔ ندیم نے تیس لاکھ کو کاروبار میں نہیں لگایا۔ اپنی آنول نال سے ہم آغوش ہونے کی معمولی قیمت ادا کی۔

فروری کے آخری دنوں کی دھوپ میں، گھر کے اینٹوں سے بنے صحن میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا ہوا، ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ سامنے چائے رکھی تھی۔ سردی کی دھوپ میں چائے ،گاؤں کی خاموشی ،اور اپنی مرضی کی کتاب، اور ذہن کو کسی بھی طرف جانے کی مکمل آزادی.....خدا گواہ ہے جنت ہے۔ یہ

جنت افسانہ نگار بننے کے بعد میں نے دریافت کی ہے۔ یہ اعتراف کرتا چلوں کہ میرے لیے جنت ذہن کو کسی بھی طرف جانے کی آزادی میں ہے۔ یہ ظالم اگر آزاد ہوجائے تو وہاں وہاں جاتا ہے، جہاں کے بارے میں اب تک لکھی گئی سب کتابیں اور سنے ہوئے سب قصے چپ ہیں۔ میں نے تو یہی سمجھا ہے کہ میں جب بھی اسے خوف کے بغیر کہیں بھی جانے دیتا ہوں، یہ کچھ نہ کچھ نیا دریافت کر کے لاتا ہے۔ اس کتاب میں حیّ ابن یقظان پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے، میرا ذہن بھی ایک جزیرے میں بھٹکنے چلا گیا۔ آدمی استاد کے بغیر اور کتاب کے بغیر بھی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، کیوں کہ آدمی کے پاس عقل ہے۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا انکشاف تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے یہ سب پڑھتے اور سوچتے ہوئے کس قدر خوشی ہو رہی تھی۔ اس خوشی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے لگا میں اڑ رہا ہوں۔ کبوتر بن گیا ہوں۔ کبوتر سے زیادہ مست مخلوق میں نے نہیں دیکھی۔ بھول ہی گیا کہ یہ خوشی ایک کتاب پڑھنے ہی سے ملی تھی۔ کتاب لکھنے کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا، یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ یہ دو ہزار آبادی کا گاؤں بھی تو ایک جزیرہ ہے۔ میں حیّ کی طرح اکیلا ہوں۔ نہیں میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ لیکن افسانے کے سلسلے میں اس کی طرح بالکل بے استادا ہوں۔ کچھ اتفاقات عجیب ہوتے ہیں۔ اپنے بے استادے ہونے پر خوش ہو رہا تھا کہ والد صاحب نے بتایا کہ انھوں نے میرے مدرسے کے استاد گاؤں کے حکیم صاحب، رضا اور کچھ دوسرے لوگوں کو بیٹھک میں بٹھایا ہے۔ مجھے ان سب کی آمد کا کچھ کچھ اندازہ ہوگیا، مگر میں اپنے جزیرے میں مطمئن تھا۔ بیوی سے چائے کے لیے کہا۔ سامنے والی دکان سے بسکٹ منگوا لیے۔ استاد جی کے چہرے پر کھنچاؤ تھا۔

مولانا، امامت کیوں چھوڑی؟ بیمار ہو، کھڑے نہیں ہو سکتے، دماغ چل گیا ہے؟

استاد جی.....

میں نے تمھیں آٹھ سال پڑھایا۔ مجھے ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہو۔ یہ میں تمھیں نہیں کرنے دوں گا۔

حکیم صاحب بولے، حضرت عبدالستار صاحب بجا فرماتے ہیں۔

میں نے امامت چھوڑی ہے، استاد جی، مذہب نہیں چھوڑا۔

وہ بھی چھوڑ دو۔جھوٹی موٹی کہانیاں لکھو گے تو مسلمان خاک رہو گے۔مت بھولو۔تم کیا تھے؟میں نے تمھیں حافظ بنایا۔تم نے میرے مدرسے میں ترجمہ،صرف،نحو،مشکوٰۃ..

جی استاد جی ،میں نے وہاں مسلم، قدوری ،تقویہ ،ھدایہ،تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، کنزالدقائق،شرح تہذیب،قطبی ،منطق، فارابی ،ارسطو کو پڑھا۔ میں نے ان کی بات اچک لی۔

تم پنجابی کے ڈھگے تھے،تمھیں عربی، فارسی ،اردو سکھائی ۔تم نام کے مسلمان تھے،آٹھ سال بعد دستار پہنی تو عالم تھے۔ تمھیں علم نافع سکھایا گیا۔تمھارے ذمے دینی تعلیم جیسا عظیم مشن تھا۔بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہ رست پر لانا تھا۔تم خود گمراہ ہو گئے ہو۔ جانتے ہو،پکا مسلمان گمراہ ہو تو اسے کیا کہتے ہیں؟اور اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جانا چاہیے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔میں اپنے مدرسے کو بدنام نہیں ہونے دوں گا۔تم پہلے آدمی ہو، جو ہمارا نام بگاڑ رہے ہو، ہماری عزت مٹی میں ملا رہے ہو۔تم امامت چھوڑ دیتے۔افسوس نہ ہوتا۔امامت چھوڑ کر کہانیاں لکھو گے۔لعنت ہے تم پر۔

حضرت صاحب غصے سے کانپ رہے تھے۔

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔بول پڑا۔آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔تفسیر،فقہ،منطق،اور دوسروں کو گمراہیوں پر نظر رکھنا بھی سیکھا۔جب درس نظامی مکمل کر کے آٹھ سال بعد اپنے گاؤں آیا تو پتا چلا کہ سب گمراہ ہیں، کسی کو نماز پڑھنی نہیں آتی تو کسی کا عقیدہ درست نہیں،کوئی نماز پڑھنا ہی نہیں چاہتا تو کوئی جھوٹ پر جھوٹ بولتا ہے۔سب بھٹکے ہوئے تھے۔اب جا کر معلوم ہوا ہے کہ.....

کیا معلوم ہوا ہے؟انھوں نے بے تابی سے پوچھا۔

'فاقصص القصص لعلهم يتفكرون ۔('سو یہ قصے کہتے رہو،شاید کہ وہ فکر کریں'۔سورہ الاعراف176)

اس سے مراد تمھارے جھوٹے قصے نہیں ہیں۔

میں کیسے بتاؤں کوئی قصہ جھوٹا نہیں ہوتا۔

اب تم اپنی باطل کہانیوں کے لیے نئی فقہ بھی بناؤ گے؟

استغفار۔حضرت ۔ایک عرض کروں۔آپ کے مدرسے کی لائبریری میں شاعری اور ناول بھی تو تھے؟

ہم صرف اقبال اور نسیم حجازی کی کتابیں رکھتے ہیں۔اور ہاں نذیر احمد کے قصے۔

نذیر احمد نے بھی تو.....

اب تم مجھے سمجھاؤ گے۔دیکھ لینا تمھارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔تمھارے سینے میں وہ سب کتابیں ہماری امانت ہیں۔میں قرآن کی رحل پر تمھیں الف لیلہ نہیں رکھنے دوں گا۔

کون رحل پر الف لیلہ رکھ رہا ہے۔زمین پر،میز پر یا گود میں تو الف لیلہ رکھی جاسکتی ہے۔آپ اس دنیا کو اپنے مدرسے کی لائبریری میں بدلنے پر کیوں تلے ہیں؟

اب تم طنز کرو گے، جرح کرو گے۔مجھے ...جس کے فتوؤں کے لیے دوسرے صوبوں سے لوگ آتے ہیں.... سمجھاؤ گے۔مجھے بتاؤ گے کہ اصل جنگ کتابوں کی ہوتی ہے۔کتابوں کی جنگ میں کتابیں ایک ساتھ نہیں، ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں۔مغرب کے کفار اپنی کتابوں سے ہمیں اپنی کتاب سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ہم اس ایک کتاب کی سربلندی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔اس جنگ میں جو ہمارے ساتھ نہیں، جس کا عقیدہ ہمارے ساتھ نہیں ،وہ ہمارا پکا دشمن ہے۔لگتا تھا،وہ میرا گلا دبوچ لیں گے۔

بالکل صحیح ۔کتابوں کی جنگ میں کتاب ہی ہتھیار ہونی چاہیے ۔ایک بات عرض کروں حضرت! کیا ہماری کتاب اس جنگ کی اجازت دیتی ہے؟وہ تو چل پھر کر غور کرنے کا حکم دیتی ہے۔غور کا نتیجہ ایک نئی کتاب ہی ہوگی۔ہوسکتا ہے،نئی کتاب ہماری اصل کتاب کی سچائی کو نئے طریقے سے ثابت کرے۔میں نے پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔

غور کرنے کا مطلب ،دوسروں کے انجام کو دیکھنا اور عبرت پکڑنا ہے۔دنیا کو دیکھنا ہے تو سیلاب کے بعد جا کے دیکھو کیسے بڑے بڑوں کے گھر محل ڈوب گئے اور وہ بھیک مانگ رہے ہیں۔غور کرنے کا مطلب شرک کا خاتمہ اور ایک خدا کو تسلیم کرنا ہے۔انھوں نے مناظرے کے انداز میں کہا۔

استاد جی ، بالکل بجا کہا، پر جب ہم غور کرنے لگتے ہیں تو وہی دماغ جو خدا نے بنایا ہے،وہ

کائنات کی اور باتوں کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ کیا وہ غلط ہے؟ کیا ذہن کے سوچنے کا طریقہ خدا نے خود نہیں رکھا؟ کیا ایک کھلونے کو چابی دے کر، کھلونے سے ہم رک جانے کا کہہ سکتے ہیں؟

سب غلط ہے۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن۔

جی، میرا ان سب پر ایمان ہے، الحمداللہ۔ میں نے کہا۔

آپ میرے لیے دعا کرنا۔ میں نے ان کے ہاتھ چومنے چاہے، مگر انھوں نے مجھے جھٹک دیا۔

ابا جان کے اصرار پر انھوں نے چائے تو پی لی، پر میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے رخصت ہوئے۔

ان کی غضب ناک نظریں کافی دیر تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ مجھے سزا دیں گے، یا معاف کریں گے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ میں ان کے ایک فتوے کی مار ہوں۔ کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ میرے سامنے کی باتیں ہیں۔ ہنستے بستے میاں بیوی کو اچانک فتوے سے پتا چلتا ہے کہ وہ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ایک فتوئی بتاتا ہے کہ فلاں مرتد ہو گیا۔ اس کے بعد آگ، خون، اور خاک ہے۔ میرے دل میں بے شک ڈر تھا، پر انھوں نے کوئی فتوئی نہیں دیا۔

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ میں نے نیک کام چھوڑ کر برا کیا۔ مجھے یہ بات بھی بری نہیں لگتی۔ یہ بات اس گیند کی طرح ہے جسے آپ دیوار پر ماریں تو سیدھی آپ کو آ لگے۔ میں نے کوئی تقریر ایسی نہیں کی جس میں یہ نہ کہا ہو۔ بھائیو، بہنو، بچو، عزیزو، بزرگو ہماری نسلیں برباد ہو گئیں۔ ہم برباد ہو گئے۔ ہم سب برے ہیں۔ ہمارے کام برے ہیں۔ ہم دنیا بھر میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔ کہیں بموں سے ہمیں مارا جا رہا ہے، کہیں ڈرون سے۔ اغیار ہمارے وطن پر قبضہ کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں لوٹ بھی رہے ہیں اور ذلیل بھی کر رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ یہ ہمارے گناہ ہیں، جن کی وجہ سے کہیں سیلاب ہیں، کہیں زلزلے ہیں۔ ہم نے اللہ اور اس کے نبی کی سنت کو ترک کر دیا۔ آج، میں اپنی تنہائی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے لوگوں کے دلوں میں مکمل برے ہونے کا یقین پیدا کیا۔ وہ جب میرے

سامنے اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر نیر بہاتے تو میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا جس نے میری زبان میں تاثیر پیدا کی۔ میں نے انھیں اس جرم میں بھی شریک قرار دیا، جس کی ان بے چاروں کو خبر بھی نہیں تھی۔ تب میں نے غور ہی نہیں کیا کہ ان کے دل میں ازلی گناہ گار ہونے کا یقین پیدا کرنے کا حق مجھے کس نے دیا؟ کسی کے گناہ کا فیصلہ، اس کے عمل کے بعد ہوتا ہے، میں نے ان کے اعمال کب دیکھے تھے؟ مجھے سب کے اعمال پر نظر رکھنے کا اختیار تھا؟ اصلی گناہ گار ہم میں سے کون تھا؟

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ مکمل برائی کا تصور کب اور کس نے پیدا کیا۔ اپنے گاؤں کے لوگوں کی حد تک مجھے یقین ہو چلا ہے کہ مکمل برائی کا تصور آدمی کے اندر، اس کی پیدائش کے ساتھ نہیں آتا۔ خدا ہر شے پر قادر ہے، پر دنیا میں برائی کو بھیجنا اس کو منظور نہیں۔ میری بھتیجی ایک نجی انگریزی سکول میں پڑھاتی ہے۔ ایک دن اس نے دل چسپ بات بتائی۔ کہنے لگی، پریپ کے بچے نقل نہیں کرتے، ون کے کم کرتے ہیں۔ ٹو کے بچے ان سے زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے جیسے بڑی کلاسوں میں جاتے ہیں نقل کی شرح بڑھتی جاتی ہے۔ میں نے مدرسے میں منطق پڑھی ہے۔ اس لیے بات بات میں منطق آجاتی ہے۔ برائی کی منطق آدمی کی فطرت میں نہیں، دوسروں کے ساتھ مقابلے کی فضا میں ہے، اور مقابلے کا سبب ڈر ہے۔ ڈر کا سبب، یہ خیال ہے کہ دنیا میں فراوانی نہیں۔ یہ خیال خدا کی خلاقیت پر شک ہے۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ دولت، اسباب، عورتیں کم پڑ جائیں گی، اگر جلدی نہ کی۔ انھیں خوف لاحق رہتا ہے کہ ان کا حصہ دوسرے لے جائیں گے، اور ان سے پہلے سب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جنھیں ان سے پہلے ملا ہے، ان سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں، یا حسد میں مبتلا رہتے ہیں، یا ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ میں یہ قصہ کبھی ضرور لکھوں گا کہ مجھے اپنے گاؤں کی مسجد کا امام بننے میں اپنے ہی ہم جماعت سے کیسے لڑنا پڑا۔ اس نے میرے عقیدے پر کیا کیا الزام نہیں لگائے، اور میرے والد کے دینی علم کا کیسے کیسے مذاق نہیں اڑایا۔ میں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جس زبان سے اللہ کا پاک کلام پڑھتا ہوں، اسی زبان سے کیا کیا بہتان نہیں باندھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو میں بھوکا مروں گا۔ دوسروں کو رزق کے لیے خدا پر بھروسا رکھنے اور توکل کی تعلیم دینے والے کا اپنا کیا حال تھا۔ لیکن جب کامیاب ہو گیا تو میں نے ہی مسجد میں اعلان کیا کہ خدا جہاں آدمی کا رزق لکھتا ہے، اسے

خاک کی مہک

وہیں حل کر رہتا ہے۔

میں نے اس گاؤں میں ابھی تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا، جو کسی کے مرنے پر ہنسا ہو۔ جب تک ہم دوسروں کی موت کا دکھ محسوس کر سکتے ہیں، تب تک ہم مکمل برے نہیں ہو سکتے۔ ویسے میں اب بھی ایک مذہبی آدمی ہوں، (میں نے نہ تو ڈاڑھی صاف کروائی ہے نہ نماز ترک کی ہے، اگرچہ ان دونوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی غیر مذہبی ہو سکتا ہے) اس لیے میں ایک لمحے کے لیے نہیں سوچ سکتا کہ خدا آدمی کی صورت میں مکمل برائی کو پیدا کرتا ہے۔ مکمل برائی کا تصور، میں اور وہ، آدمی کے اندر اسی طرح پیوند کرتے ہیں، جس طرح شریفہ پر کیکر پیوند کر دیا جائے۔ آپ اس میں شامل نہیں ہیں۔ افسانہ نگار بننے کے بعد میں سچ بولنے لگا ہوں، اور اس کی ایک وجہ آپ ہیں۔ آپ بات کو سمجھتے بھی ہیں، اور اس کا تماشا بھی نہیں بناتے۔ لوگ، اس لیے سچ نہیں بولتے کہ انھی جیسے لوگ، ان کا تماشا بناتے ہیں۔ ہر ایک کو ڈر ہے کہ سامنے والے نے اپنی جیب میں ایک ڈگڈگی چھپائی ہو، جسے وہ کسی بھی وقت نکال کر بجانا شروع کر سکتا ہے، اور آپ کو بندر بننے پر مجبور کر سکتا ہے۔

پھر بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ میں اس رات کے واقعے کے بعد امام نہیں رہا۔ افسانہ نگار بن گیا۔ میں نے مدرسے سے فارغ التحصیل ہوتے ہی بی اے، اور اس کے ساتھ ہی بی ایڈ کر لیا تھا۔ والد صاحب نے کہا بھی کہ بی اے کر کے کیا کرو گے۔ مسجد چھوڑی تو گناہ گار ہو گے۔ قرآن بھولو گے تو گناہ کرو گے۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں حافظ قرآن نہ رہا تو ان کے سارے خاندان کی بخشش کا کیا بنے گا، مجھے تو مدرسے میں بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ میں پورے خاندان کی روز محشر بخشش کا سبب بنوں گا، حالاں کہ خود والد صاحب سب کی بخشش کا سامان اپنے تئیں کر چکے تھے۔ اب معلوم نہیں، مجھے وہ خاندان میں شامل کرتے ہیں یا نہیں۔ میں مدرسے میں اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر بخشش دوسروں کی نیکیوں ہی سے ہونی ہے تو پھر سب پیسے والوں کو ایک ایک یتیم کو اپنا بیٹا بنا کر مدرسے بھیج دینا چاہیے۔ ان کے لیے دونوں جہانوں میں جنت ہے۔ ایک دن میرے خیالات کا علم استاد جی کو ہوا تو مجھے مرغا بنا کر پچاس جوتے مارے گئے۔ گالیاں الگ دی گئیں۔ یہ سب بچوں کے لیے معمول کی بات تھی، اسے تربیت کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ میں نے جوتے اور گالیاں کھاتے ہوئے کہا استاد جی، ان

خاک کی مہک

جوتوں کا اجر آپ کو ملے گا یا مجھے؟ اس پر ایک جوتا زور سے لگا۔

اب میرا ارادہ بھی استاد بننے کا ہے۔ لیکن پہلے میں دو ایک سال صرف افسانے لکھنا چاہتا ہوں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھے ضرور ندامت ہوتی ہوگی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، مجھے ایک لمحے کے لیے ندامت نہیں ہوئی۔ بھلا جو شخص خود کو دریافت کر لے، وہ نادم ہوتا ہے، یا خوش۔ میں نے امامت اور خطابت کے ذریعے یہ دریافت کیا کہ میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ لیکن یہ سب رفتہ رفتہ ہوا ہے۔ جن دنوں میں، مدرسے میں پڑھتا تھا، میرے ہاتھ ایک کتاب لگی۔ نسیم حجازی کا کوئی ناول تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے، جس احساس سے میں گزرا، وہ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ میں اس کتاب کی کہانی بڑی حد تک بھول گیا ہوں۔ ذرا سا یاد ہے کہ کوئی شخص کارواں کے ساتھ گھوڑے پر سفر کرتا ہے۔ اس شخص سے متعلق کوئی خاص بات میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے اصل میں فرق محسوس کیا تھا۔ دوسری کتابیں پڑھتے ہوئے، میں نے کبھی خود کو لفظوں سے وجود پانے والی دنیا میں غرق ہوتے محسوس نہیں کیا تھا، اور اس غرق کر دینے والی لذت کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ ہماری یادداشت میں صرف وہی چیزیں محفوظ رہتی ہیں، جنھوں نے لذت دی۔ باقی سب بھول بھال جاتا ہے، یہاں تک کہ دکھ بھی، اور وہ احساس جرم بھی، جو اس لذت کے ساتھ کہیں چپک گیا ہو۔ اس کے بعد میں نے انبیا، اولیا اور مشاہیر کی کہانیاں پڑھیں۔ میرا جی کرتا کہ انھیں کوئی دوبارہ لکھے۔ ان میں وہ کیفیت نہیں ہوتی تھی، جسے میں نے نسیم حجازی کے یہاں دیکھا تھا۔

مجھے آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ میں دنیا کو ایک افسانہ نگار کے طور پر دیکھتا ہوں۔ جسے مرد، عورت اور بھیڑیے گڈمڈ ہوتے نظر آتے ہوں، وہ افسانہ نگار کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ خود کو دریافت کرنے میں دیر ہوئی۔ اس رات عشا کی اذان سے پہلے جب میں غسل کر رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا، جیسے ایک کینچلی ہے جو میرے وجود سے اتر رہی ہے۔ میں جو کچھ اصل میں ہوں، بالآخر اسے ظاہر ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ میں نے بھیڑیے کو قبول کرنے کی ہمت پیدا کی۔ بھیڑیے کہیں اور سے تو نہیں آتے۔ جنگل آخر مریخ پر تھوڑے ہیں۔ عورت کسی اور سیارے کی مخلوق تھوڑی ہے۔ میں نے اپنے ڈر سے ڈرنا بند کیا۔ میں لوگوں کو چھوٹی چھوٹی مثالوں سے بڑی بڑی

خاک کی مہک

باتیں سمجھاتا تھا۔ مجھے تب احساس نہیں تھا کہ میں انھیں کہانیاں سنا رہا تھا۔ وہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں میں اپنی طرف سے گھڑتا تھا، یا پرانی کہانیوں میں ردوبدل کرتا تھا۔ ایک بار میں نے بھیڑیے اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے کی کہانی سنائی۔ بھیڑیے نے بکری سے کہا تو مجھ سے ڈرتی ہے؟ بکری نے کہا بھوکے سے ہر ایک کو ڈرنا چاہیے۔ بھیڑیا بولا: بھوکے سے نہیں طاقت ور سے ڈرنا چاہیے۔ بکری کہاں چپ رہنے والی تھی۔ طاقت ور سے نہیں، طاقت سے ڈرنا چاہیے۔ بھیڑیا بولا: ایک ہی بات ہے۔ بکری نے بڑی بوڑھیوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا: طاقت اور چیز ہے، طاقت ور کچھ اور ہے۔ آج تم جوان ہو، تمھارے پاس طاقت ہے۔ آج تمھارا بچہ کمزور ہے، کل یہی طاقت جس پر تم گھمنڈ کرتے ہو، اس کے پاس ہوگی۔ طاقت کسی کے پاس سدا نہیں رہتی، اور جس کے پاس ہوتی ہے، وہ خونخوار بن کر رہتا ہے۔ تو بھائیو، ہمیں بکری کی بات یاد رکھنی چاہیے۔ مگر ایک بات بکری بھول گئی تھی۔ وہ بھی یاد رکھنی چاہیے۔ بکری کے پاس بھی ایک طاقت تھی، جس سے بھیڑیا محروم تھا۔ بھیڑیے سے بات کرنے کی طاقت۔ بھائیو، جو بھیڑیے سے بات کرسکتا ہے، اس کے دل سے شیر کا ڈر بھی جاتا رہتا ہے۔

اصل کہانی، شیر اور بکری کی تھی، اور کچھ اور تھی۔ میں نے شیر کی جگہ بھیڑیے کو دے دی، اور کہانی بھی بدل دی۔ میں نے اس کہانی کے بعد اپنے اندر ایک نئی چیز دریافت کی تھی: اختیار۔ میں اس بات کا اختیار رکھتا ہوں کہ ایک جانور کی جگہ دوسرے کو کہانی میں شامل کرلوں۔ واقعہ تبدیل کرلوں، نیا گھڑلوں اور اس کے باوجود میری باتوں کو ایک بڑے سچ کے طور پر سمجھا جائے۔ اللہ، گھڑی گئی کہانی میں اتنے بڑے بڑے سچ کیسے سما جاتے ہیں! نہیں، ہم کہانی نہیں گھڑتے، سچ تک پہنچتے ہیں۔ لیکن میں نے اس دریافت پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ اس سے زیادہ ظلم اور کوئی نہیں کہ آدمی اپنی ان چھوٹی چھوٹی دریافتوں کو نظر انداز کرے۔ انھی چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعے کوئی بہت ہی بڑی ہستی ہم سے کلام کرتی ہے۔ اس وقت میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ کہانی کو بدلنے کا اختیار مجھے کس نے دیا، اور کیوں دیا۔ لیکن ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی تھی۔ ایک عجیب سی لہر آتی، اور مجھے بہا لے جاتی۔ میں ایک بلندی پر پہنچ جاتا جو انا کی بلندی بالکل نہیں تھی؛ وہاں ایک روشنی دکھائی دیتی۔ مجھے لگتا، میں نہیں بول رہا، وہ روشنی بول رہی ہے۔ افسانہ نگار بن کر میں نے اپنے ساتھ دیانت داری

برتی ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو دنیا سے شاید سچ بولتا، مگر خود سے جھوٹ بولتا۔ لیکن وہ شخص دنیا سے سچ کیسے بول سکتا ہے، جو خود سے جھوٹ بولتا ہے!

اب میں یہ اعتراف کرسکتا ہوں کہ اس شام جو واقعہ ہوا، اس میں رتی بھر جھوٹ نہیں تھا۔ وہ واہمہ بھی نہیں تھا۔ وہ اتنا ہی سچ تھا، جتنا ایک بندہ بشر سچ سن سکتا ہے، اور سمجھ سکتا ہے۔ میں نے سچ کو اسی طرح محسوس کیا، جس طرح کوئی انگارے کو اپنی ہتھیلی پر محسوس کرتا ہے۔ یہ انگارہ کہیں باہر سے نہیں آیا تھا۔ مجھے اس واقعے کے صدقے، افسانہ نگاری کا پروانہ ملا۔

میں نے ان چند ہفتوں میں کچھ کچے پکے افسانے لکھے ہیں۔ پہلا افسانہ ایک مختصر واقعے کی شکل میں تھا۔ وہ میں آپ کو کسی وقت سناؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے آپ کو کچھ اور باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ یہ کہ میں نے گاؤں کی مسجد کی امامت چھوڑی ہے، گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ میرا نہیں۔ گاؤں کی خاطر ہی تو میں افسانہ نگار بنا ہوں۔ مسجد کو ایک سے بڑھ کر ایک خطیب اور امام ملتے رہیں گے۔ افسانہ نگار تو کسی کسی گاؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ مجھے جب پتا چلا کہ میں اصل میں افسانہ نگار ہوں تو پہلا خیال ہی مجھے گاؤں کا آیا۔ اگر میں نے بھی گاؤں کی کہانی نہ لکھی تو..... مجھے یہ سوچ کر دھکا لگا کہ دنیا میں کروڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر کسی کتاب میں میرے گاؤں کا ذکر نہیں۔ اس گاؤں نے کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں کیا کہ اس کا ذکر تاریخ میں آجاتا۔ کچھ سیاستدان الیکشن سے پہلے یہاں آتے ہیں، گلیوں کی نالیوں اور سولنگ کا افتتاح کرکے وہاں اپنے ناموں کی سلیں لگا جاتے ہیں۔ ہر گلی کے عین آغاز میں ایک سل لگی ہوئی ہے۔ گاؤں کی شہرت کا سبب یہ لوگ ہوسکتے تھے۔ مگر دن بھر ان سلوں پر گدھا گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، بھاگتے بچوں اور کبھی کبھی آنے والی کاروں سے اڑنے والی گرد ان پر پڑتی رہتی ہے۔ کوئی اس گرد کو صاف نہیں کرتا۔ گاؤں کی گرد، گاؤں والوں کی زبان بولتی ہے، اور آنے جانے والوں کو گاؤں سے متعلق بہت کچھ سمجھاتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا اگر میں نے بھی اپنے افسانوں میں اس گاؤں کا ذکر نہ کیا تو کبھی کسی کو معلوم نہیں ہوسکے گا کہ انسانی تاریخ میں ان لوگوں کا بھی ایک کردار ہے۔ ان کے پاس بھی وہ بڑی بڑی کہانیاں ہیں، جن پر بڑے شہروں کے لوگ فخر کرتے ہیں۔ یہاں بھی قتل ہوتے ہیں۔ زنا ہوتے ہیں۔ بچیوں اور بچوں سے زیادتی ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے پکی عمر کے رنڈوے نے

ایک غریب مراثی کی آٹھ سال کی بچی کو خون وخون کر ڈالا۔ دس ہزار میں بات ختم ہوئی۔ تھانے کے بجائے پرہنہ (پنچایت) میں فیصلہ ہوا کہ اصل میں بچی نے کوئی غلط چیز کھالی تھی۔ رنڈوے اور گاؤں کی عزت بچانے کا یہی راستہ تھا۔ قربانی کا تصور قدیم سے یہاں چلا آتا ہے۔ یہی کچھ بڑے شہروں میں ہوتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ شہر والوں کو اپنے شہر کی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں اس بچی کی کہانی ضرور لکھوں گا، اور اسی کی زبانی لکھوں گا۔ کہانی میں وہ پورے گاؤں کے خلاف استغاثہ تیار کرے گی۔

دو سال پہلے تو بڑا ہی انوکھا واقعہ یہاں ہوا تھا۔ سب کے سینوں میں محفوظ ہے، کہیں لکھا نہیں گیا۔ اب سینوں کا کیا اعتبار یہاں ہر وقت کاٹھ کباڑ جمع ہوتا رہتا ہے۔ اچھی اچھی باتیں لوگ بھول جاتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ کچھ سے کچھ بن جاتی ہیں۔ خیر، واقعہ یہ تھا کہ شہامند مسور کا اٹھارہ سالہ بیٹا غریب گدھی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ لڑکوں نے دونوں کے بیاہ کا پروگرام بنایا۔ بڑوں نے بس زبانی لعن طعن کی۔ بات پھیلی تو پتا چلا، ایسا زمانوں سے ہوتا آ رہا ہے۔ سننے کو ملا سب جوان ہوتے لوگ انھی پر ہاتھ سیدھا کرتے ہیں۔ غریب بکریاں، گدھیاں، اور گائے بھینیس نشانہ بنتی ہیں۔ مجھے تو کئی دن ابکائی آتی رہی، اور میں چھ ماہ تک دودھ نہیں پی سکا۔ خیال آتا ہے کہ اگر کسی دن گدھیوں نے انسانی سر والے یا انسانی دھڑ والے بچوں کو جنم دینا شروع کر دیا تو؟؟؟ بھئی میں تو ابھی اس سے آگے نہیں سوچ سکتا، لیکن اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا ان بے زبانوں کی کہانی نہیں لکھی جانی چاہیے؟

یہاں بھی تھانے میں مقدمے بنتے ہیں۔ اور بہت سی باتیں ہیں جو صرف اس گاؤں سے مخصوص ہیں۔ اس گاؤں میں استاد، استانیاں، حکیم، مولوی، ڈاکٹر، ترکھان، لوہار، کمہار، دھوبی، مراثی، مصلی، کسان، محکمہ تعلیم کے کلرک، دکان دار رہتے ہیں۔ پہلے صرف سنیوں کی مسجدیں تھیں، اب شیعوں کی مسجد بھی ہے۔ سنی بھی کہاں ایک ہیں؟ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ کون پیروں فقیروں کو مانتا ہے، کون نہیں، تو بس یہاں آ کر جمعے کا خطبہ سن لیں۔ سنیوں کی مسجد میں دونوں طرح کے علما کو خطبے کی دعوت دی جاتی ہے۔ خطبے کے بعد کبھی کبھی چھوٹی موٹی بحث بھی ہو جاتی ہے۔ یہ بحث جس انداز سے ختم ہوتی ہے، اس سے لگتا ہے کہ کسی دن کوئی قربان ہوگا۔ جہاں بحث ختم ہی نہ ہو، بس لوگ فریقین کو منت ترلے یا

زبردستی چپ کروا دیں، وہاں دلوں میں لاوا پکتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر بتا سکتا ہوں کہ کم از کم مذہبی بحث سے اگر دماغ مطمئن اور دل پرسکون نہ ہو تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنی جان دے سکتا ہے، اور کسی کو جان لے سکتا ہے۔ یہ فرق بھی کیا جانا لگا ہے کہ فلاں شیعہ ہے، اور فلاں سنی ہے، اور ان گھروں کی نشان دہی کی جانے لگی ہے۔ پندرہ رجب کو ہر غریب شیعہ کا گھر بھی پہچانا جاتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا، مگر اب سنی ماں باپ بچوں کو نیاز کھانے سے منع کرتے ہیں، لیکن موت فوت واحد واقعہ ہے جب سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ شیعوں کو الگ اور دوبارہ جنازہ پڑھنے کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میرے گاؤں میں ایک جوان عورت ہے۔ سب اسے سوہنی کہتے ہیں۔ بہت کم بولتی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ گونگی ہے۔ وہ کبھی کسی کے گھر میں کام کرتی ہے، کبھی کسی کے گھر میں۔ لوگ ٹھٹھے کے انداز میں کہتے ہیں کہ اس کا گاؤں پر بڑا احسان ہے، اس کی وجہ سے گاؤں میں کوئی کنجر خانہ نہیں بنا۔ اسی طرح ایک اور دیالو عورت ہے، جس کا خاوند اس سے بھی زیادہ دیالو ہے۔ ایک نوجوان ہیں، سارا دن بانسری بجاتے ہیں۔ لوگ رک کر سنتے ہیں۔ ایک ننگا فقیر ہے۔ لوگ اسے کپڑے پہناتے ہیں، وہ ایک ہی دن میں انھیں پھاڑ ڈالتا ہے۔ اگلے ہی دن، اس کا ستر بس ایک دھجی سے ڈھکا ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ گاؤں کی جنوبی سمت میں واقع ایک مزار پر گزارتا ہے۔ سنا ہے وہاں کئی بے اولاد عورتیں اس سے دعا کروانے آتی ہیں، اور کئیوں کی مرادیں پوری ہوئی ہیں۔ وہ اسے پیسے، کپڑے، پھل، اناج دے جاتی ہیں، پیسے وہ پھاڑ دیتا ہے، کپڑے پھینک دیتا ہے، جو مزار کے دوسرے فقیروں کے کام آتے ہیں، اور پھل پرندوں، جانوروں کے آگے ڈال دیتا ہے۔ کبھی کسی نے اسے کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ گاؤں کا کوئی شخص اس کے ننگے پن کا برا نہیں مانتا۔ دو دن گلیوں میں نظر نہ آئے تو لوگ ڈرنے لگتے ہیں۔ اگر آندھی بارش آ جائے تو اسے یاد کرنے لگتے ہیں۔ وہ بہ ظاہر کسی گھر کا فرد نہیں، کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں سے آیا ہے، مگر ہر گھر اس کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔ اسے دیکھنا ایسے ہی ہے، جیسے کوئی شخص اپنے خواب کو بیداری کی حالت میں دیکھے۔ اس کے دیکھنے میں کچھ ڈر، کچھ حیرت، کچھ اسرار، کچھ وابستگی، اور کچھ گریز شامل ہوتا ہے۔

گاؤں میں ایک بزرگ ڈاکٹر صاحب ہیں، انھوں نے کبھی نماز قضا نہیں کی، کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔ ہر مہینے کوئی نہ کوئی مریض ان کے کلینک پر دم توڑتا ہے، لیکن ہر وقت مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اب جہاں بھیڑ ہوگی، وہاں کریانے، کھانے پینے اور ایزی لوڈ کی دکانیں بھی ہوں گی۔ یہاں صبح سے رات گئے تک رونق لگی رہتی ہے۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ لوگ پریشان نہیں ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب دکان پر نہ ہوں تو ان کے کمپاؤنڈر موجود ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں گاؤں میں شیخ فرید کے بیٹے کی شادی ہوئی، جس لڑکی سے شادی ہوئی وہ ڈاکٹر صاحب کی دکان پر اپنی والدہ کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے بعد دکان پر بھیڑ مزید بڑھ گئی۔ گاؤں میں ایک بیوہ عورت ہے، جس کے چھ بچے ہیں، اور چھ کے چھ پاؤں سے معذور ہیں۔ وہ کھجور کے پتوں سے پھوہڑی (جس سے چارپائی بنی جاتی ہے) بناتی ہے، اور گزارا کرتی ہے۔ صدقہ خیرات قبول نہیں کرتی۔ لیکن یہ تو سب اوپر اوپر کی باتیں ہیں۔ گاؤں کی اصل دنیا کچھ اور ہے، جسے کم از کم پچاس سال یہاں رہنے کے بعد آدمی دریافت کر سکتا ہے، یا پھر جواب میرے افسانوں میں لکھی جانے لگی ہے۔ آپ اسے میری تعلّی نہ سمجھیے۔ اسے میرا جوش کہیے۔

اور کچھ نہ سہی، انسانی نوع کو باقی رکھنے میں تو اس گاؤں کے لوگوں کا کردار ہے۔ یہ کوئی آسان کام ہے۔ زندگی جیسی نادر الوقوع چیز کو سہارنا آسان تھوڑی ہے۔ یہی بات میں نے اس گاؤں پر پہلی کہانی لکھتے ہوئے دریافت کی۔ اور بھی کئی باتیں دریافت کیں، جن سے میں پہلے واقف ہی نہیں تھا۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو پتا چلا کہ گاؤں کی اصل دنیا کو بغیر اس پر کہانی لکھے دریافت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ جن آنکھوں سے اس گاؤں کو دیکھ رہے تھے، ہم آنکھوں والوں سے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو برا کہتے کہتے، ایک دوسرے سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر گاؤں کو ایک ایسا شخص چاہیے، جو برائی بھلائی کے چکر سے نکل کر اسے دیکھے۔ لیکن ایسے شخص کو ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی ادا کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

گاؤں کے چند سرکردہ لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے پاس تین راستے ہیں۔ واپس امامت پر آ جاؤں، گاؤں چھوڑ دوں۔ اگر پہلے دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب ایک

ہفتے کے اندر نہیں کرتا تو انتظار کروں کہ میرے بارے میں کیا نیا فیصلہ ہوتا ہے۔ میں نے گاؤں والوں سے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے میرے لیے تین راستے تجویز کیے۔ وہ چاہتے تو آخری فیصلہ پہلے ہی سنا دیتے، جو مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا ہوگا۔ صرف ایک فتویٰ۔ فتوے کے آگے میری جان کی کیا حیثیت ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے والد صاحب بھی اس فیصلے میں شریک ہیں۔ جب وہ باقی لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ کر میری سزا تجویز کر رہے تھے تب وہ ایک باپ نہیں، ان سب کا حصہ تھے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگ، جسے ہم اپنی زبان میں پرِہنبہ کہتے ہیں، ملتے ہیں تو وہ کچھ غیر تحریری معاہدوں کے محافظ ہوتے ہیں، اور کچھ نہیں ہوتے۔ وہ غیر تحریری معاہدے اس قدر طاقت ور ہیں کہ کسی کو ان کے آگے سرتابی کی تاب نہیں۔ میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ آخر میری زندگی میں وہ پہلا دن آ ہی گیا ہے کہ میں پورے ہوش و حواس کی حالت میں خود اپنے لیے ایک فیصلہ کر سکتا ہوں۔ پورے ہوش و حواس میں اپنے خلاف بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، کسی ندامت، کسی افسوس کے بغیر۔ کہاں جاؤں گا، یہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں، لیکن دو باتیں مجھے اچھی طرح معلوم ہیں۔ میں گاؤں سے چلا بھی گیا تو گاؤں میری آخری سانس تک میرے اندر رہے گا۔ نہیں، اندر رہے گا ہی نہیں، ایک درخت کی طرح بڑھے گا بھی۔ سایہ دے گا اور پھل بھی۔ جنھیں میری طرح گاؤں بدری کی سزا ملی ہے، وہ سمجھ سکیں گے کہ آدمی کے اندر سے وہ خاک کا ٹکڑا ایک لمحے کو الگ نہیں ہوتا، جہاں پہلی مرتبہ آدمی نے چلنا سیکھا ہوتا ہے، اور جہاں کھڑے ہو کر پہلی بار آسمان کو دیکھا ہوتا ہے، جہاں کی خاک آدمی کے نتھنوں میں، سانسوں میں اور خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ آدمی سب بھول سکتا ہے، اپنے پرکھوں سے لے کر اپنے آبائی مذہب تک کو، نہیں بھول سکتا تو اس خاک کی مہک کو۔ سو سال کی عمر میں بھی وہ مہک پہلے دن کی طرح تر و تازہ رہتی ہے۔ نہیں، اس کی تازگی بڑھتی رہتی ہے۔ مجھے ندیم کی طرح ایک دن واپس آنا ہے! میں نے بیوی سے کہہ دیا ہے کہ اگر اچانک مر گیا تو مجھے اسی گھر کے صحن میں، اسی جگہ دفن کرنا ہے، جہاں سردیوں کی دھوپ میں بیٹھ کر میں نے بے شمار کتابیں پڑھی ہیں، اور کچھ صفحے سیاہ کیے ہیں، اور جہاں بیٹھ کر میں نے یہ سب لکھا ہے!

■•◆•◆•◆•■

ہاں، یہ بھی روشنی ہے!

کچھ نہیں بدلا۔ سب کچھ بدل گیا۔ اس محل میں اس نے انتیس برساتیں گزاری تھیں۔ بارہ سال بعد محل پر پہلی نگاہ پڑی تو لگا کہ کچھ نہیں بدلا، دوسری نظر سے معلوم ہوا، کچھ پہلے جیسا نہیں۔ کتنی برساتیں گزریں تب کہیں جا کر دوسری نظر حاصل ہوئی۔ بوڑھے باپ کی التجا اسے محل میں لائی تھی۔ باپ سے دیکھا نہیں گیا کہ شاہی قبیلے کا وارث اپنی رعایا کے دروازے پر کھڑا ہو۔ باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ سمجھا پھر بھی نہیں، بیٹا اس کا وارث نہیں۔ بیٹے نے وراثت کا اصول بدل دیا تھا۔ باپ، بیٹے کو نام دے سکتا ہے، وراثت بیٹا خود بناتا ہے۔ راجہ کا بیٹا، راج کو گرد کی طرح جھاڑ دیتا ہے، اور ننگے پاؤں چلتے ان زمانوں میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کی خبر بھی باپ کو نہیں ہوتی۔ وہ اپنا حسب نسب نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے۔ باپ اور بیٹے کے پرکھوں کا شجرہ الگ ہو جاتا ہے۔

اس کو محل کی سیر کی ہوس نہیں تھی۔ وہ جہاں چاہتا سیر کے لیے جا سکتا تھا۔ محل میں اس کی نظریں سیکڑوں لوگوں پر پڑ رہی تھیں۔ وہ سب اسے تعظیم و پرستش کے جذبات سے دیکھ رہے تھے، مگر اس وقت اس کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ رفیق خاص نے پہلی بار اس کی آنکھوں کو بے چین دیکھا تو پریشان ہوا۔ وہ سمجھ گیا۔ رفیق خاص سے کہا: سنو، ایک بے چینی ایسی بھی ہے جو صرف یاد دلانے کے لیے ہے کہ وہ اب بھی آدمی ہے۔ آدمی ہونا ایک بات ہے، اور آدمی رہنا دوسری بات ہے۔ رفیق خاص نے عرض کی، آدمی رہنا بڑی بات ہے۔

سب اشارہ پا کر رخصت ہوئے۔

وہ دونوں، اسی کمرے میں ہیں، جس میں اس نے چند گھنٹوں کے بچے اور اپنی ہم عمر بیوی کو چھوڑ کر وفادار غلام کے ساتھ جنگل کا راستہ لیا تھا۔ کیا میں اس کے دل کو پڑھ سکتا ہوں؟ اس نے سوچا۔ وہ جہاں چاہتا تھا، چھن بھر میں پہنچ جاتا تھا۔ وہ خود کو ہزاروں صورتوں میں، سب کی صورتوں میں ڈھال سکتا تھا، وہ آدمی تھا پر آدمی سے بڑھ کر بھی تھا، اس کے پاس وہ ساری روشنی تھی، جو آدمی میں ظاہر ہو سکتی ہے، اور جسے آدمی کی ہستی سہار سکتی ہے۔ کیا وہ اس روشنی کے ساتھ، عورت کے دل میں اتر سکتا ہے؟ کیا وہ اس روشنی سمیت واپس بھی آ سکتا ہے؟

اس نے ایک لمحے کو سوچا۔

تم چپ کیوں ہو؟ کچھ بولو۔

اس نے آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہرا دیں۔ لو پڑھ لو۔

وہ اس کے دل میں تھا۔ گزرے عالم کی سیر کرنے لگا۔

جب تم اس رات رخصت ہو رہے تھے، ایک عجب بیقراری تمھارے قدموں میں تھی۔ تم تین مرتبہ کھڑکی تک گئے، باہر جھانکا، قدم آگے کیے، پھر واپس آئے۔ میرے پیروں کو پہلے چھوا، پھر ان پر پلکیں رکھیں، پھر ہونٹ رکھے۔ تپش، نمی، مہک، لرزش، کچھ دوسری ان کہی چیزیں پاؤں کے راستے میرے دل میں اتر گئیں۔ میرے پیروں پر ہونٹ تم نے رکھے، زمین میں، مَیں گڑ گئی۔ تم نے میرے گال یا ماتھا یا ہونٹ اس لیے نہیں چومے کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں۔ تم بارہ سالوں میں یہ تک نہ جان سکے کہ میں تمھیں آنکھوں سے زیادہ، تمھارے بدن کی خوشبو اور بدن کے گرد روشنی کے ایک ہالے سے پہچانتی ہوں.... جانے تم کس روشنی کو ڈھونڈنے گئے تھے.... تم جوں ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے، میں نے تمھاری خوشبو محسوس کر لی تھی، حالاں کہ میں اس رات نڈھال تھی، اور خود اپنے جسم سے اٹھتی ایک اور طرح کی مہک محسوس کر رہی تھی۔ تم نے سمجھا تم نے مجھ سے معافی مانگ لی، انتظار نہیں کیا کہ میں بتا سکوں کہ مجھ میں معاف کرنے کی سکت ہے بھی یا نہیں۔ شاید تمھیں میری استعداد کا خیال بھی نہیں آیا۔ یہ کیسی معافی تھی؟ تمھارا دھیان میری طرف تھا کب؟ تم نے پالنے میں سوئے ننھے کو بار بار دیکھا

،جس کے آنے کا ہم نے بارہ سال... پورے بارہ سال....ہم دونوں نے انتظار کیا۔ جب وہ آیا تو تم اسے بارہ گھنٹے بھی نہ دیکھ سکے۔ تم نے ثابت کیا، منش کے لیے دنیا ہے، ناری کے لیے منش اور اس کا دیا ہوا تحفہ یعنی بچہ۔ ایک نیا منش، جو کوکھ سے سیدھا چھاتی پر آ جاتا ہے، پھر سینے میں۔ وہ ایک نئی قید میں آ جاتی ہے۔ منش نہیں دیکھتا... منش کچھ نہیں دیکھتا کہ کوکھ اور چھاتیاں سوکھتی ہیں تو عورت پر کیا گزرتی ہے، وہ تو دنیا کے لیے نکل چکا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ساری دنیا کے بھید، ساری رمزیں جاننے کا جنون ہوتا ہے، نہیں ہوتا تو عورت کے دل کو جاننے کا جنون۔ وہ ناری کے دل کو جیتنے، اور آگے بڑھ جانے سے پرسن ہوتا ہے۔

وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے۔

تم وہ نہیں ہو، کوئی اور ہو۔ تم کیسے اس دل کو پڑھ سکتے ہو؟ تم پرائے بن گئے ہو۔ تمھیں کہاں معلوم ہوگا، میں نے چھ سال تک تمھارے پل پل کی خبر رکھی۔ تم ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں گئے، ایک کے چرنوں میں بیٹھے، دوسرے کی بندگی میں پیش ہوئے۔ سب کو چپ چاپ چھوڑا، اور آگے چلتے رہے۔ تم نے بھوک پیاس کاٹی، بھوگ بلاس ترک کیا۔ بدن سوکھ کر کانٹا بن گیا، مانو یہ کانٹا میرے دل میں چبھ گیا۔ اس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔ میں سوچتی تھی، تم ضرور واپس آؤ گے۔ مجھے خود معلوم نہیں، مجھے یقین کیوں تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس زندگی کو دھیان میں بھی نہیں لا سکتی، جس میں تم نہ ہو۔ تم آئے ہو، پر کوئی اور بن کر۔ میں غلط سوچتی تھی، مجھے کہاں خبر تھی کہ جو سدھار جاتا ہے، وہ واپس نہیں آتا۔ وہ آتا بھی ہے تو اور بن کر آتا ہے۔

یہاں بیٹھو، میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ اس نے اشارے سے بلایا، اور کہا: نہ میں وہ ہوں، نہ تم وہ ہو۔

کیا میں تمھارے بچے کی ماں نہیں ہوں؟ کیا وہ تمھارا وارث نہیں؟ کیا اُسے اپنی وراثت حاصل کرنے کا حق نہیں؟

تم میرے ہی بچے کی ماں ہو، مگر وہ نہیں ہو، جو پہلے تھیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وہی ہیں جو بارہ سال پہلے تھے، یہ دھوکا ہے، ایک بھول ہے، اور اس بسواس کا نتیجہ ہے کہ ہم سدا

موجود تھے، اور سدا موجود رہیں گے۔ ہر ایک کو اپنی وراثت خود بنانی ہے۔ وراثت مانگنے سے نہیں، کشٹ سے ملتی ہے۔

میں تو وہی ہیں، مگر تم واقعی بدل گئے ہو۔ اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

اچھی بات ہے کہ تم مجھے پہچاننے لگی ہو۔ خود کو بھی پہچان جاؤ گی۔ کوئی شے دائم نہیں، مگر دائم ہونے کا مسلسل دھوکا دیتی ہے، یہ گیان کی طرف پہلا قدم ہے۔

سب لوگ تمھیں سب سے بڑی آتما کہتے ہیں، تمھاری پرستش کرتے ہیں، میں تو پہلے دن سے تمھاری پوجا کرتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے تمھیں پہچانا تھا۔ اس نے پرتیت سے کہا۔

آتما؟ کون سی آتما؟ آتما دھوکا ہے۔ آتما ہوتی تو تم یوں نراش ہوتیں؟ آتما ہوتی تو میں اس طرح مارا مارا پھرتا؟

تم بدل گئے ہو، یہ تو تمھارے ان گیروے کپڑوں، ننگے پاؤں، ہاتھ میں کاسے ہی سے ظاہر ہے، مگر تم کاٹھ کے بن جاؤ گے، اس کا مجھے بسواس نہیں ہو رہا۔ اس کا دل جیسے زخمی تھا۔

اِس پر اُس نے خاموشی اختیار کی۔ اس کا چہرہ اب بھی مطمئن تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ کمرے کی دیواروں کو دیکھا، اس کھڑکی کو دیکھا، جہاں سے وہ اس رات روانہ ہوا تھا۔ ڈھلتے سورج کی زرد کرنیں کمرے کی دیواروں پر پڑ رہی تھیں۔ کمرہ پہلے ہی کی طرح تھا۔ اسے کچھ راتیں یاد آئیں، لیکن رات میں پر چھائیوں کی طرح گزر گئیں۔ اُس نے، اِس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے وہ پھول یاد آئے جنھیں وہ باغ میں بیٹھ کر دیکھا کرتا تھا، ایک لمحے کو کھلے ہوئے، روشن، حسین نظر آتے، اگلے لمحے مرجھا جاتے، اس سے اگلے سمے زمین پر سوکھی زرد پتیاں ہوتیں۔ عورت کا چہرہ بھی پھول ہی ہے۔ عورت کا جسم بھی پھول ہے۔ مرد کا جسم بھی پھول ہے۔ اس جہالت کے دور ہونے میں وقت لگتا ہے کہ پھول کا کھلنا، اس کے مرجھانے کی طرف اس کا سفر ہے۔ ہر ابتدا، اپنے انت کی طرف بڑھتی ہے۔

تم دنیا کے بڑے بڑے سوالوں کے جواب دیتے ہو، مجھے ایک سوالی سمجھ کر ایک سوال کے جواب کی بھکشا دے دو۔

پہلی باراس کے دل میں جنبش سی ہوئی۔

پوچھو۔

تمھارے پاس روشنی ہے جو سب کی جہالت دور کرتی ہے۔ کیا میرے دل کا اندھیرا دور نہیں کرسکتی؟

تم نے صحیح سوال پوچھا۔ صحیح سوال، صحیح راستے کی طرف قدم ہے۔

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ کو چھونا چاہا۔ اُس نے روک دیا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ میرے صحیح قدم کو تم نے کیوں روک دیا؟ کیا میرا صحیح قدم، تمھارے صحیح راستے سے ٹکراتا ہے؟

تم ہر سوال پوچھو۔ پر قدم اٹھانے سے پہلے صحیح راستہ چنو۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ تمھارے دل کا اندھیرا میں دور نہیں کرسکتا۔ ہاں، تم خود چاہو تو دور کرسکتی ہو۔ اس نے کمرے کے ننگے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اِس مرتبہ اُس نے، اُس کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بنتی کی، مجھے اپنے دل کا اندھیرا دور کرنے سے نہ روکو۔ پاؤں پر مٹی جمی تھی، اس کا جی چاہا مٹی کا ایک ایک ذرہ پہلے ہاتھ کی لکیروں میں جذب کرے، پھر یہ ہاتھ وہ اپنی آنکھوں کو لگائے، پھر اپنے بدن پر پھیرے۔ اسے ایک لمحے میں یقین حاصل ہوگیا کہ صرف ایک پل میں معجزہ ہوسکتا ہے، وہ دوبارہ جی سکتی ہے۔ سالوں سے سوکھی کھیتی بس پل بھر میں ہری ہوسکتی ہے۔ اس نے لمبی پتلی انگلیوں والے سوکھے پاؤں سے ہولے ہولے مٹی کی تہ ہٹائی۔ لمس کا ایک تیز سیل اس کے سارے بدن میں سرایت کرگیا۔ ہلکی سی روشنی پھیلی۔ اندھیرا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ پرندے پہلے پھڑ پھڑائے، پھر چہکنے لگے۔ سارے میں تازہ پھول کھل اٹھے۔ سویا ہوا شہر جاگ پڑا۔ اس نے سہج سہج دونوں پاؤں پہلے ہاتھوں سے صاف کیے، پھر دھوئے۔ اس نے ان کھردرے پاؤں پر آنکھیں رکھ دیں۔ آسمان پر تارے اگ آئے تھے۔ کمرے میں مشعل جلادی گئی تھی۔

اس نے پاؤں کو ذرا سی جنبش دی۔

جب تم پاؤں پر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیرتے ہوئے، اپنے بدن کے شہر کو جاگتے ہوئے

محسوس کررہی تھیں تو جو روشنی پھیلی تھی، وہ میں تھا، جو پرندہ چہچہایا تھا، وہ میں تھا، جو پھول کھلے تھے، وہ بھی میں تھا۔ تم اپنے بدن میں لمس کے جس دھارے کو محسوس کررہی تھیں، وہ بھی میں تھا۔ تمھیں جاننے میں وقت لگے گا کہ تمھارے دل کا اندھیرا اس وقت تک دور نہیں ہوسکتا، جب تک میں تمھارے اندر ہوں۔

میں تمھیں اپنے دروازے کی چوکھٹ سمجھتی ہوں، اور تم خود کو میرے راستے کا پتھر کہتے ہو؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنی مدت بعد جاگنے والا شہر دوپہر بھی نہ دیکھے۔

ہر دوسرا، راستے کا پتھر ہے۔ تم اپنی روشنی کو خود آکار کرو۔

میں خود کو دوسرا سمجھتی ہوں، اور تمھیں اپنی روشنی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے میری روشنی سے کیوں دور کرتے ہو؟

تم بھول کا شکار ہو، اس بھول کا، جس کا آغاز تمھارے جنم سے ہوا۔ اسی جنم میں اپنی بھول ختم کرو۔ تمھارے بدن کا شہر کئی سالوں بعد جاگا ہے، تم اس کی سب آوازوں کو سننا چاہتی ہو۔ سنو، ہر آواز شروع ہوتے ہی، اپنے انت کی طرف سفر کرتی ہے۔ ہر صبح جب دوپہر کی طرف بڑھتی ہے تو پہلے صبح کا زوال ہوتا ہے، پھر دوپہر کا۔ بے بس کردینے والے لہو کی تپش ٹھنڈی ہوکر رہتی ہے۔ کوئی آگ سدا نہیں جلتی۔ ہر آگ جلنے بجھنے، شعلے سے راکھ ہونے کا سلسلہ ہے، اور یہ سلسلہ دکھ دیتا ہے۔ تم مجھ میں اپنی روشنی نہیں دیکھ رہیں، اپنا دکھ دیکھ رہی ہو، مگر نہیں جانتی ہو۔ اس نے کھیم کی کہانی دہرائی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے وہ خود کھڑی ہے، ایک موہنی بچی کی صورت، تھوڑی ہی دیر میں خوبرو لڑکی، اگلے چند لمحوں میں کہن سال عورت، پھر لاٹھی ٹیکتی بوڑھی عورت۔ کیا تمھاری آنکھوں پہ بندھی پٹی اب بھی باقی ہے؟ اس نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ سوال کیا۔

اس نے سوچا، اگر وہ آج بھی نہ کہہ سکی تو کبھی نہ کہہ سکے گی۔

تمھیں یہ کیوں گھمنڈ ہے کہ تمھارا گیان مکمل ہے؟ تمھارے گیان میں صرف تم ہی تم ہو، کوئی دوسرا نہیں۔ تم نے بارہ سال جنگلوں میں گزارے۔ میں نے بھی بارہ سال اس قید خانے میں گزارے، کاٹھ کی طرح نہیں۔ تم نے اپنے لیے ساری کائنات کو چن لیا، مجھے اس محل کے بندی خانے میں ڈال

دیا۔ تمھیں خیال آیا کہ جس سفر پر تم نکلے تھے، اس کی آرزو مجھے نہیں ہو سکتی تھی؟ تم بھی یہ سوچتے تھے کہ عورت میں آتما نہیں ہوتی؟ کیا تنہائی میں عورت پر اس بات کا یلغار نہیں ہوتی کہ دنیا میں دکھ کیوں ہے، بڑھاپا کیوں ہے، موت کیوں ہے؟ تم اپنی کھوپڑی کو میری کھوپڑی سے بڑا سمجھتے ہوگے، مگر تمھارا دل، میرے دل سے بڑا نہیں ہے۔ تمھاری کوکھ ہوتی تو پھر بھی جنگل جاتے؟ کوکھ بھی سوچتی ہے۔ تم ہر زمانے میں، ہر جگہ، کوئی بھی صورت اختیار کر کے جا سکتے ہو۔ تم اس زمانے میں بھی گئے ہو، جب تم اپنی ماں کی کوکھ میں قوس بنے ہوئے تھے؟ میں تمھیں بتاتی ہوں کہ کوکھ بھی سوچتی ہے، اور وہاں موجود جیو بھی سوچتا ہے۔ باہر آکر سب بھول بھال جاتا ہے۔ جانتے ہو جیو کیا سوچتا ہے؟ وہی سوچتا ہے جو کوکھ سوچتی ہے، اور جو کوکھ سوچتی ہے وہی جیو سوچتا ہے۔ یہ بھی سنو، کوکھ اور جیو سے پہلے ایک پل ایسا آتا ہے، جب دو سانسیں ایک سانس بنتی ہیں۔ ایک نہ بن سکیں تو جیو اور کوکھ میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ مانو جیو پہلے پل ہی جلاوطن ہو جاتا ہے، اور آگے جلاوطن ہوتا رہتا ہے۔ لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ تمھارے گمان میں کبھی یہ بات آئی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُن دو سانسوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا' جن کے ایک ہونے سے تمھارا جنم ہوا' اور تم پہلے پہل ہی جلاوطن ہو گئے۔ میرا گمان یہ کہتا ہے کہ تم دو سانسوں کے ایک سانس بننے کو بھول چکے ہو۔ اس لیے تمھیں یاد نہیں کہ پریم، گیان سے بڑا ہے۔ تم کہتے ہو، ہر شے اپنے زوال کی طرف بڑھتی ہے۔ میں کہتی ہوں، ہر شے اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی ہے۔ تکمیل بھی خاتمہ ہے' لیکن زوال اور طرح کا خاتمہ ہے' تکمیل دوسری طرح کا۔ تمھارا من زوال کے خاتمے میں اٹک گیا ہے۔ شہر کو آنکھیں کھولنے کے بعد انگڑائی لینی چاہیے، چلنا چاہیے، دوڑنا چاہیے۔ دوپہر ہو، رات ہو، تاکہ پھر ایک صبح ہو۔ ہر صبح ایک نئی صبح ہوتی ہے۔

یہ ایک چکر ہے۔ یہ چکر دکھ دیتا ہے۔ یہ چکر ختم کروگی تو بزیت ہوگی۔ اس نے اندیشہ کے انداز میں کہا۔

تم کہتے ہو لہو کی تپش شروع ہوتے ہی خاتمے کی طرف بڑھتی ہے۔ یہ ہے تمھارا گیان! گیان میں اتنی بزدلی، اتنا ڈر بھی ہوتا ہے، مجھے بسواس نہیں آتا۔ یہ ڈر پریم میں کیوں نہیں؟ جسے تم چکر کہتے ہو، اسی چکر نے تمھیں، مجھے جنم دیا اور پھر ہم نے اُسے جنم دیا۔

تم اور طرح سمجھ رہی ہو۔ میں آدمی کے پیدا ہونے کے خلاف نہیں۔

لہو کی تپش کے بغیر آدمی پیدا ہو سکتا ہے؟

وہ لاجواب ہو گیا۔ وہ ڈر گیا۔ بارہ سال محل کی چار دیواری میں رہنے والی، کیسے اس کے آنند کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا۔

لوہا گرم تھا۔

سنو، جب تم چلے گئے تو میں چھ سال روئی۔ پھر میں نے ایک خواب دیکھا۔ اپنی کھوپڑی میں بھرے سارے جہان کی شکتیوں کو بلا لو تاکہ اس خواب کو سنتے ہوئے، تمھارا آنند برقرار ہے۔ ساتویں سال کی پہلی رات تھی۔ وہ محل کے دوسرے کمرے میں سونے لگا تھا۔ میں نے آدھی رات سے پہلے کنیزوں کو جانے کے لیے کہہ دیا۔ نیند خواب کی طرح تھی۔ میرا اس پر اختیار نہیں تھا۔ ذرا ذرا سی دھند پھیلنا شروع ہوئی۔ مدھم سر کا آغاز ہوا۔ خیال کا سلسلہ ٹوٹنے لگا، اور ایک نئی دنیا کا دروازہ معمولی چیں کے ساتھ کھلنے لگا۔ پھر مکمل بے خبری۔ پھر ایک نئی دنیا میں تھی۔ جیسے بیج پھوٹتا ہے تو دھرتی کی ناف پر ایک لکیر سی ابھرتی ہے۔ مدت کے بعد وہ لکیر ابھری۔ بیج نے اودھم مچایا۔ مانو دھرتی کی گہرائی میں بھونچال آیا۔ بالآخر بیج ٹوٹ گیا، اور بھونچال کو قرار آ گیا۔ بے خبری سے پہلے کی حالت لوٹ آئی۔ اتنی سرشاری۔

اس نے دیکھا، اس کا ہاتھ اس کے کاندھے تک آیا۔ لگا، جیسے اس کی گردن دبوچ ڈالے گا۔

کیا یہ خواب تھا اور بیج کس درخت کا تھا؟ اس کی آواز میں عجب درد تھا۔

وہ اس کی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ تم نے ہی تو کہا ہے کہ تم سب صورتوں میں ڈھل جاتے ہو' لیکن شاید بھول جاتے ہو کہ' کس صورت میں کہاں ڈھلے؟ وہ درخت تم ہی تھے۔ جب اس نے اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ وہ اس کے سینے سے ہونٹوں تک پہنچی۔ اِدھر رات آدھی ہوئی تھی، مشعل بجھا دی گئی تھی، اُدھر دونوں کے بدن دہک رہے تھے۔ آگ آگ سے ٹکرا رہی تھی۔ سمندر ہچکولے کھا رہا تھا۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ بارش ختم

ہونے کے لیے شروع ہوتی ہے۔ بارش کتنی اچھی ہے، اس نے محسوس کیا، لیکن بارش بالآخر ختم گئی۔ دونوں کے جسم بارش میں نہائے درخت کی طرح چمک رہے تھے۔ دو سانسیں، ایک سانس بننے کے بعد ہموار تھیں۔

مجھے بسواس ہے کہ یہ رات ایک نئے سویرے کو جنم دے گی، اور اس مرتبہ تم اسے اپنی روشنی پانے کے سفر میں اکیلا نہیں چھوڑ گے!

اس نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، مسکرایا، اور کہا: ہاں! یہ بھی روشنی ہے۔

وہ دوسری مرتبہ مسکرایا تھا۔ اس کے گواہ دیوتا نہیں تھے، اکیلی وہ تھی۔

اس نے وہ مسکراہٹ جس پتھر میں قید کی، اسے ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا۔

■•♦•♦•♦•■

جھوٹ کا فیسٹول

اوائل اپریل کی رات، دس بجے کا وقت۔ گاؤں سے دو میل باہر مہر عباس کا ڈیرہ، جسے ایک نئی بنی پکی سڑک گاؤں سے ملاتی ہے، اور دونوں کے بیچ نہر ہے۔ مٹی سے بنی دو فٹ چوڑی، اونچی فصیل نما دیوار کے بیچ وسیع احاطہ، مشرقی دیوار میں بھاری چوبی پھاٹک۔ مغربی سمت میں کمروں کی ایک قطار، برآمدے سمیت۔ پھاٹک کے دائیں طرف ٹیوب ویل اور درختوں کا ایک جھنڈ، جسے دیکھ کر لگتا ہے، جیسے رات کے بدن پر سیاہی کا ایک بڑا گومڑ نمودار ہو گیا ہے۔ بائیں جانب پکی اینٹوں سے بنی مسجد ہے، جس کے بے دیواری صحن میں ایک بلب روشن تھا، صحن میں کچھ صفیں لپٹی ہوئی ایک طرف رکھی تھیں، اور ایک صف کھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یہ سارا منظر اسرار آمیز خاموشی، تنہائی اور اداسی پیدا کر رہا تھا۔ ڈیرے کے اردگرد چارے اور پکی اور نیم پکی گندم کے کھیت تھے۔ ہلکی سی خنکی اور کچھ کچھ حبس محسوس ہو رہا تھا۔ ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں بیس پچیس چارپائیاں دائرے کی صورت بچھی ہیں۔ درمیان میں سٹیج سا بنا ہے، جس پر دس لوگ پگڑیاں پہنے بیٹھے ہیں۔ چارپائیوں پر ساٹھ ستر کے قریب لوگ ہوں گے۔ ایک بڑے پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے مہر عباس بیٹھے ہیں۔ بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ چوڑے ماتھے کے نیچے نیم خوابیدہ آنکھیں۔ گھنی نوک دار مونچھیں، آفتابی چہرے کو رعب دار بناتی ہیں۔ پچاس کے لگ بھگ ہوں گے۔ لمبا قد، جسم موٹاپے کی طرف مائل۔ جب شہریار نے مہر عباس سے میرا تعارف کروایا تو انھوں نے مجھ سے مصافحہ کیا تھا، ان کے ہاتھ کافی سخت محسوس ہوئے تھے۔

ایک چارپائی پر میں شہریار کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ہم دونوں میٹرک میں ہم جماعت تھے اور

اس عید پر کئی برسوں بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ وہی مجھے یہاں لایا ہے۔ کہنے لگا، تم پچیس سال پہلے شہر چلے گئے، صرف دو دنوں کے لیے عید برات پر آتے ہو۔ بھول بھال گئے ہوں گے کہ یہاں کیا کیا تھا، کیا کچھ باقی رہا، اور کیا کچھ بدل گیا۔ میں نے کہا، میرے ذہن میں تو گاؤں اور یہاں کے لوگوں کا وہی پرانا تصور ہے۔ گاؤں میں وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرتا ہے۔ 'کبھی گزرتا تھا، میری جان، اب نہیں'۔ شہریار نے میری تصحیح کی۔ میں نے پوچھا، مثلاً کیا تبدیل ہوا۔ اس کے جواب میں مجھے وہ یہاں لایا ہے۔ مہر عباس کو ہر سال طرح طرح کے مقابلے کرانے کا شوق ہے، مگر سب کا تعلق بولنے کے فن سے ہوتا ہے۔ اس سال انھوں نے قصے کے انداز میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ رکھا ہے۔ میں چونکا تو شہریار بولا، تمھارے شہر میں طرح طرح کے فیسٹول ہورہے ہیں، مہر عباس نے سوچا دیہات کیوں پیچھے رہیں۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں، جو ہم فیسٹول کے خاتمے پر کریں گے، لیکن یاد رکھو، یہاں سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ شہروں کے فیسٹول کا طرح یہ بھی خاص لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہم یہاں خاص لوگوں میں شامل ہیں۔ میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ڈیرے کے احاطے میں باتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ کچھ لوگ چائے اور دوسرے لوازمات مہمانوں کو پیش کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک جوان آدمی کھڑا ہوتا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بھائیو! ہمارے مہر صاحب کو ریچھوں، کتوں، سانڈوں کی لڑائیوں سے نفرت ہے۔ انھیں باتوں کے فنکاروں کا مقابلہ پسند ہے۔ ہر سال وہ ایک موضوع پر باتوں کا مقابلہ کرواتے ہیں۔ پچھلے سال چکری مقابلہ کروایا تھا، جس میں نور محمد کا تیتر بازی لے گیا تھا۔ اس سال کا موضوع ہے: جھوٹ۔ جی ہاں، جھوٹ۔ جو شخص ناقابل یقین جھوٹ بولے گا، اسے مہر صاحب اپنے ہاتھ سے اعلیٰ نسل کی ایک گائے دیں گے، دس ہزار روپیہ، ایک پگڑی اور شیلڈ۔

جھوٹ کا مقابلہ، اور شیطان کے شر سے بچنے کی دعا کے ساتھ؟ میں نے شہریار کی طرف شرارت اور حیرانی سے دیکھا جو میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھا تھا۔

شیطان سے پناہ نہیں مانگ رہے، اس سے مقابلہ کرنے جارہے ہیں۔ سنتا جا۔ شہریار نے بھی شرارت سے جواب دیا۔

اور یہ چکری مقابلہ کیا ہے؟ میں تو یہ نام سن کر ہی چکرا گیا ہوں۔ میں نے شہریار کو کہنی مار کر پوچھا۔

اسی لیے کہتا ہوں، ہر سال ایک مہینے کے لیے یہاں رہا کرو، تاکہ اپنی ہی مٹی سے بے خبر نہ ہو جاؤ۔ شہریار کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

بے خبر تو ہو چکا ہوں۔ سکول میں تھے تو ان سب چکروں کی فرصت نہیں تھی، پھر ایف ایس سی، انجینئرنگ، شادی، بال بچے۔ میں نے جواز پیش کیا۔

خیر، چکری مقابلہ کالے تیتروں میں ہوتا ہے۔ کون سا تیتر زیادہ دیر تک اور زبردست بولتا ہے۔ شہریار نے میرے علم میں اضافہ کیا۔

انعام تیتر کو ملتا ہے، یا مالک کو؟ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

تیتر کو شاباش اور شہرت ملتی ہے، انعام مالک کو۔ اچھا اب چپ ہو جاؤ۔ مہر عباس برا مانیں گے۔ شہریار نے کہا۔

اس آدمی کی کچھ باتیں ہم نہیں سن سکے تھے۔ جب ہم چپ ہوئے ہیں تو جہاں سٹیج بنا تھا وہاں چند بچے، نوجوان اور دو ایک بڑی عمر کے لوگ سفید کرتے، لال واسکٹ اور لال پگڑی، اور لال بارڈر والی نیلی لنگیاں اور جھانجھریں پہنے، ہاتھ میں گھنگھروؤں والی چپٹیاں لیے آئے۔ ایک شخص نے ڈھول پر تھاپ دی، اور جھومر ڈانس شروع ہو گیا۔

یہ فیسٹول کا باقاعدہ آغاز ہے۔ شہریار نے مجھے اپ ڈیٹ کیا۔

خوب۔ یہ تو زبردست ہے۔ میں تو آغاز ہی میں اس کے سحر میں گم ہو گیا۔ بہت سال پہلے میں نے ایک شادی میں یہ ڈانس دیکھا تھا یا پھر کبھی ٹی وی پر خبروں میں کہیں اس کی جھلک دیکھی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اپنے سامنے، رات کے وقت، جب باہر مکمل خاموشی تھی، شاید کہیں کھیتوں میں کوئی گیدڑ بولتا ہوگا، جس کی آواز آج یہاں نہیں پہنچ رہی تھی، میں یہ ڈانس اپنی آنکھوں کے سامنے، مکمل فرصت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ ابتدائی چند لمحوں میں مجھے لگا، جیسے میرے اندر کوئی گٹھڑی ہے، جو کھلنے لگی ہے۔ بدن میں ذرا سی سنسناہٹ محسوس ہوئی، پھر ایک لہر سی جسم میں محسوس ہونے لگی۔ گٹھڑی میں سے

جانے کیا کیا برآمد ہونے لگا۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جو کچھ میرے سامنے پرفارم کیا جارہا تھا، اس سے میرا اس قدر ذاتی اور اتنا گہرا جذباتی تعلق ہے، اور میں اس سے کس قدر بے خبر اور کتنا لاتعلق تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، جیسے جیسے جھانجھروں اور گھنگھرودَں کی آوازوں اور رنگین کپڑے پہنے جھومریوں میں ہم آہنگی سی قائم ہورہی تھی، میری کیفیت تقریباً ویسی تھی، جیسی میں نے محبت کے بالکل اوّلین لمحوں میں اس وقت محسوس کی تھی، جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ اس ڈانس نے مجھے اندر سے پہلے ادھیڑا، پھر نئے سرے سے یکجا کرنا شروع کیا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آخر یہ فن اب تک زندہ کیوں ہے۔ سب لوگ حیرت ومسرت کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے جھومری ایک سحر کی صورت سب پر طاری ہو چکے ہیں۔ میں نے نجانے کتنے عرصے بعد ایک جگہ، ایک نکتے پر اپنی پوری ہستی، اپنے پورے وجود، اپنے ذہن وجذبے کو مرتکز محسوس کیا، اور مجھے لگا کہ میں اس سب کے بغیر کس قدر نامکمل تھا، جیسے اس پہلی ملاقات میں لگا تھا۔ رقص وموسیقی میں کس قدر طاقت ہے، ہماری روحوں پر چھا جانے کی، یہ میں نے اس رات دریافت کیا، میں نے غلط کہا، اس رقص وموسیقی میں یہ طاقت ہے، جس کا تعلق اسی خاک کے ٹکڑے سے ہے، جہاں میں نے پہلی مرتبہ چلنا، دوڑنا، کھیلنا، بولنا، دوست بنانا، اور لڑنا سیکھا تھا۔ میں پچیس سالوں میں بالکل بھول گیا تھا کہ اس سب سے میں کس قدر وابستہ ہوں، جہاں میں بس دو چار دنوں کے لیے سال بعد جاتا ہوں، یا کسی موت فوت پر جایا کرتا ہوں، اور بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں۔ شہر میں مجھے اپنے اندر کسی کمی کا احساس ہوتا رہا ہے، جس کے لیے میں کبھی سینما، کبھی مسجد، کبھی پارک چلا جایا کرتا تھا، یا کبھی سیلف ہیلپ کی کوئی کتاب پڑھ لیا کرتا تھا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کوئی گھاؤ ایسا بھی ہوتا ہے، جو اپنی خاک کے اس ٹکڑے سے بچھڑنے کا پیدا کردہ ہوتا ہے، اور وہ ٹکڑا آدمی کو دنیا کے سب سے، مقدس مقامات سے بھی زیادہ مقدس محسوس ہوسکتا ہے، اور جہاں کے پرندے، درخت، لوگ، بولی، ماہیے، دوہڑے، اور یہ جھومر ڈانس، اور قصے دنیا کے سب سے عظیم فن پاروں سے زیادہ عزیز محسوس ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ آدمی کی روح کے اس گوشے میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں، جو وجود میں سب سے دور افتادہ ہوتا ہے، اور جس سے تعارف زندگی کا سب سے یادگار واقعہ ہوتا ہے۔ مجھے بس ایک قلق رہے گا کہ میں نے اس ڈانس پارٹی

کا حصہ بننے کی خواہش کو لگام دی، حالاں کہ کئی لوگ اس میں شریک ہوگئے تھے۔ میں اپنی روح کے جس دور افتادہ گوشے میں پہنچ کر سرشار ہوا تھا، جانے کیسے، وہاں میں نے اپنی شہری، نام نہاد معزز وبلند مرتبہ شناخت کو در آنے کا موقع دیا۔ لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس کے بعد سے میں نے اس شہری، معزز، اشرافی شناخت پر ہنسنا شروع کردیا ہے، اور اس میں اضافے کی ہوس سے آزاد ہوگیا ہوں۔

سوتو نہیں گئے، کافی دیر سے تم نے کچھ پوچھا نہیں۔ شہریار بولا۔

جاگا ہوا ہوں، اور پوری طرح۔ مجھے نہیں لگتا کہ شہریار نے میرے اس جملے کا ٹھیک مطلب سمجھا ہوگا۔

میں نے وقت نہیں دیکھا، اس لیے نہیں معلوم کتنی دیر جھومر جاری رہی۔ جھومر ختم ہوئی تو لوگوں نے جھومریوں کو انعام دیے، میں نے بھی ایک ہزار اس بچے کو دیا، جو مجھے سب سے اچھا جھومری لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہی آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے مخاطب ہوکر کہنے لگا، بھائیو، آپ سب کو یہ افتتاح پسند آیا ہوگا۔ یہ سب نجی مہر عباس کی وجہ سے ہے۔ یہاں کے لوک فنکاروں کی جیسی قدر دانی یہ کرتے ہیں، پورے علاقے میں کوئی اور نہیں کرتا۔ کئیوں کو یاد ہوگا، دو سال پہلے مہر صاحب نے یہاں ایک مشاعرہ کروایا تھا، جس میں علاقے کے نامی گرامی شاعروں نے حصہ لیا تھا۔ اسی مشاعرے میں ایک دوہڑا پڑھا گیا تھا، میں یہ دوہڑا الجپال مہر عباس کی نذر کرتا ہوں، اور اس کے بعد آج کا مقابلہ شروع کرتے ہیں۔

نت اپنی بال کے سیکی کرتوں آس کسے تے رکھ نئیں
جداں سیت ریاض اگھلا جاوے کوئی پرت کے ویدھا اکھ نئیں
جتھے عزت دا یار سوال ہووے رکھ مول بچا کے ککھ نئیں
ککھ یار شریکاں چ رہ جاون بھاویں رہے کلی دا ککھ نئیں

[تو ہمیشہ اپنی آگ جلا کر سینک، کسی اور سے امید نہ رکھ۔ ریاض، جب قسمت سو جاتی ہے تو کوئی پلٹ کر بھی خبر نہیں لیتا، جہاں عزت کا سوال ہو وہاں ایک تنکا بھی بچا کر نہ رکھ۔ اپنے حریف رشتہ

داروں میں اپنی آبرو قائم رکھنے کے لیے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے]

اس کے بعد مقابلے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دس لوگ جھوٹ کے اس فیسٹول میں شریک ہوئے۔ سب نے خوب جھوٹ بولے۔ جھوٹ کیا تھے، کہانیاں تھیں۔ میں نے سب سیل فون پر ریکارڈ کر لیں۔ تین کہانیاں مجھے زیادہ دل چسپ لگیں۔ پہلی کہانی ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے سنائی۔ اس نے اپنا نام بہاول بتایا۔ میں یہاں ان کہانیوں کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ ایک خراب ترجمہ ہے۔ میں ادیب تو ہوں نہیں کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہو۔

ایک زمیندار تھا، رب نواز۔ بستی موسیٰ کلاں کا۔ پانچ ہزار مربعوں کا مالک۔ بھائیو پانچ ہزار مربعوں کا مالک۔ اس کے باپ نے دو دن گھوڑی دوڑائی تھی۔ اسے تو دو گز زمین ملی، پر رب نواز کو پورے پانچ ہزار مربعے۔ دولت نہ کوئی حد نہ شمار۔ پچاس کوٹھے تھے، روپوں سے بھرے ہوئے۔ ووٹ ہوتے نہیں تھے، دولت کہاں خرچ کرتا؟ اس نے ایک رات کی شادیوں کا شوق پال لیا۔ شام کو نکاح پڑھتا، رات گزارتا اور صبح، روپوں میں تول کر طلاق کا کاغذ اس کے ہاتھ میں پکڑا تا۔ کہتا، جا بی بی عیش کر۔ سیکڑوں لوگوں کو روزگار ملا ہوا تھا۔ اللہ جانے کہاں کہاں جاتے لڑکیاں تلاش کرتے، اللہ کو خبر ہے، کیسے انھیں لاتے تھے، ماں باپ کو لالچ دیتے یا اغوا کر لاتے۔ ہر شام کو لڑکیوں کی قطاریں لگی ہوتیں، جس طرح منڈی لگی ہوتی ہے۔ کچھ کو دس دس دن انتظار کرنا پڑتا، تب کہیں باری آتی۔ دیگیں ہر وقت چولھے پر چڑھی رہتیں۔ پانچ ایکڑ کا ڈیرہ تھا۔ گرمیوں میں چارپائیاں احاطے میں بچھی رہتیں۔ سردیاں ہوتیں تو دلال اور چھوہریاں الگ الگ کمروں میں پڑے پلنگوں پر جا سوتے۔ درجن سے زیادہ بندے حساب کتاب رکھنے والے تھے، کون کب آیا، کب گیا، کتنا کس کو دیا، کوئی چھوکری دو بار تو نہیں آئی۔ اپنی باری پر دلال، چھوہر کے ساتھ پیش ہوتے۔ چھوہری پسند آنے پر رب نواز سے انعام لیتے اور نئے شکار کے لیے نکل

پڑتے۔ چھوہری پسند نہ آتی، تو بھی دونوں کو اتنا خرچ پانی ملتا کہ سال بیٹھ کے کھا سکتے۔ اکثر چھوہریوں کی شادیاں اسی پیسے سے ہوئیں۔

بھائیو! جاگتے ہو نا، ایک دفعہ کیا ہوا۔ پوہ کی رات کا قصہ ہے۔ سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی رب نواز کو پسند آئی۔ صبح ہوئی۔ نوکر دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔ کوئی گرم پانی لیے، کوئی نئے کپڑے لیے، کوئی ناشتے کا انتظام کیے۔ دروازہ نہیں کھلتا۔ سورج چڑھ آیا۔ دھوپ دیواروں پر چڑھنے لگی۔ سب پہلے حیران ہوئے، پھر گھبرائے، پر کسی کو دروازے پہ ہاتھ مارنے کی جرأت نہیں۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ سب نوکر چاکر دروازے پر حریان پریشان کھڑے ہیں۔ کوئی دعا کر رہا ہے، کوئی قیاس کر رہا ہے، کوئی حکیم کی دوا کا ذکر کر رہا ہے، کوئی اس چھوہری کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ پر کسی کو سمجھ نہیں آ رہا کہ کریں تو کیا کریں۔ آخر، منشی جمال دین دروازے پر آتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے۔ سائیں۔ سائیں۔ سائیں رب نواز۔ آگے سے چپ۔ اب سب لوگ ڈر رہے ہیں، اور ایک جیسا سوچ رہے ہیں۔ سب کی زبان پر ہے، اللہ خیر کرے۔ منشی دروازہ پر ہولے سے ہاتھ مارتا ہے۔ پھر وہی چپ۔ لوگ اور ڈر جاتے ہیں۔ منشی کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اب وہ زور سے ہاتھ مارتا ہے۔ ٹاہلی کی لکڑی کا بنا ہوا، اتنا بڑا دروازہ۔ شیر کی فوٹو بنی ہوئی۔ ایک کیل منشی کے ہاتھ میں چبھ جاتی ہے۔ منشی کے ساتھ، رحم دین، کمال، رستم، آٹھ دس اور لوگ آتے ہیں۔ دروازہ کو دھکا دیتے ہیں۔ دروازہ تو اندر سے بند ہی نہیں تھا۔ کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ رب نواز کے دروازے کو ہاتھ لگانے کی جرأت ہی کسی کو نہ تھی۔ بند کیوں کرتا۔ اندر... بھائیو... اندر تو غضب ہو چکا تھا۔ پلنگ کے پائیوں پر، بستر پر، نیچے خون تھا۔ رب نواز نے چھوہری کو اپنی بانہوں میں کس رکھا تھا۔ ڈرتے ڈرتے منشی آگے گیا تو پتہ چلا کہ چھوہری کو سینے پر گولی لگی ہوئی تھی، اور رب نواز جیسے آدھا

سو رہا تھا، آدھا جاگ رہا تھا۔ اللہ جانے کتنے گھنٹے گزر گئے تھے۔ رب نواز لاش کو بازوؤں میں لے کر میٹھی نیند سو رہا تھا۔

جھوٹ، سفید جھوٹ۔ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ بہاول کے جھوٹ کی تعریف کر رہے تھے، یا بے یقینی کا اظہار کر رہے تھے۔ بہاول ظالم ہنس دیا۔ لیکن لوگوں نے بہت سنجیدگی اور یقین سے کہا کہ ان کے سامنے اتنا بڑا جھوٹ بولا گیا ہے۔ پانچ ہزار مربعے بجا، دولت کے انبار بھی ٹھیک، ہر رات شادی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں؛ یہاں تک سب قصہ کہانی تھا، پر رب نواز ایک لاش سے لپٹ کر کئی گھنٹے سویا رہا، کہانی کی دنیا سے باہر کا واقعہ تھا۔ وہ جھوٹ سننا چاہتے تھے، پر کہانی کے اندر رہتے ہوئے۔ لوگوں کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ بہاول کی جھوٹی کہانی میں الجھتے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ اگلے آدمی کو بلایا جاتا، مہر عباس نے بہاول کو اپنے پاس بلایا۔ خدا جانے کیا کھسر پھسر کی۔ شہریار اور میں اندازہ لگاتے رہے۔ ہم اس بات پر حیران تھے کہ جس واقعے کو جھوٹ بنا کر پیش کیا گیا تھا، لوگ اس میں اس طرح کھو گئے تھے، جیسے یہ سب ابھی ابھی ان کے سامنے ہوا ہے۔ یہ رب نواز ہے، یہ سینے پر گولی کا زخم کھائی ہوئی چھوہری ہے۔ وہ سب دیکھتے ہیں، اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں، یار کیسے ایک لاش سے لپٹ کر کوئی اتنی دیر سو سکتا ہے؟ لاش تو ہماری دنیا کا حصہ نہیں۔ ہم اس دنیا کو کتنی دیر برداشت کر سکتے ہیں جو ہماری دنیا سے باہر کی دنیا ہے۔ ادھر مجھے واقعی پسینہ آیا تھا۔ مجھے یاد آیا میں نے اس طرح کا ایک واقعہ کہیں پڑھا تھا۔ انگریز کے زمانے میں عدالت میں اسی طرح کا مقدمہ پیش ہوا تھا۔ لڑکی کو اس لیے مارا گیا تھا کہ اس نے بس اتنا کہا تھا کہاں ہے تمھاری مردانگی، میں اور کتنی دیر انتظار کروں؟ لیکن وہ واقعہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ خیر، کہانیاں سفر کرتی رہتی ہیں۔ یار ڈر گئے ہو؟ شہریار نے مجھے پسینہ پونچھتے دیکھ کر کہا۔ یار ڈرنے کی بات تو ہے، وہ کیسے ایک لاش کو اتنی دیر اپنی بانہوں میں لے کر میٹھی نیند سویا رہا۔ شہر پہنچ کر اس کا جائزہ لینا۔ بس اتنا یاد رکھ، جو زمیندار ہر رات ایک نئی عورت چاہتا ہے، وہ حشیش کا ایک باغ بھی لگاتا ہے۔

لیکن وہ ہوتا تو آدمی ہی ہے؟

آدمی نہ کہو، جانور کہو۔

خدا کے لیے شہریار۔ کوئی جانور جنس کا اتنا بھوکا نہیں ہوتا۔ میں نے احتجاج کیا۔

اچھا چھوڑو، ہم جھوٹ کے فیسٹول میں ہیں، اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو، جیسے یہ سب سچ ہو۔ شہریار نے یاد دلایا۔

یار کیوں بار بار بھول جاتا ہوں کہ ہم جھوٹ کا جشن منانے یہاں آئے ہیں۔ شاید اس لیے بھول جاتا ہوں کہ جشن تو جھوٹ نہیں۔ یہ ہمارے سامنے جھوٹے قصے سنانے والے تو حقیقی ہیں، اور ہم بھی اصلی ہیں... لیکن کیا پتا، یہ بھی سب جھوٹ ہو، یہ سارا فیسٹول ہی فراڈ ہو۔ ہم اسی طرح کے سائے ہوں، جیسے رات کے وقت درخت کا سایہ ہوتا ہے۔ یعنی ہوتا ہی نہیں۔ لیکن سایہ تو ہوتا ہے، جاتا کہاں ہے؟ جیسے خواب، دن کو کہیں چلے جاتے ہیں، سائے رات کو کہیں کوچ کر جاتے ہیں... ہر جانے والا لوٹ آتا ہے، جیسے میں.... کہاں جھوٹ ہے، کہاں سچ... یہ آسانی سے کہاں پتا چلتا ہے۔ سیاہ رات میں درخت، سیاہی کے گومڑ لگتے ہیں۔ اس میں سچ کہاں ہے، اور جھوٹ کہاں ہے، درخت کہاں ہے، گومڑ کہاں ہے۔ میں اپنے اندر کی جنت دریافت کرتا ہوں، ایک بھولے بسرے سچ سے بغل گیر ہوا تھا... اس کے فوراً بعد جھوٹے قصے سننے لگتا ہوں اور ان کے سچ.... نہیں جھوٹ.... نہیں جھوٹ اور سچ کے جھٹپٹے میں الجھنے لگتا ہوں۔ حالاں کہ میرا جی چاہا تھا کہ میں وہاں سے چلا آؤں، اور اس کیفیت کو اس وقت تک برقرار رکھوں، جب تک .... جب تک ممکن ہے، جب تک میرے بس میں ہے، ایک انسان کے اختیار میں ہے... اپنا اختیار بھی تو دیکھوں، وقت پر کتنا ہے... میں جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔

اچھا اپنا فلسفہ کچھ دیر کے لیے اپنی جیب میں رکھو، اور اگلے آدمی کو سنو، وہ کہاں کی کوڑی لاتا ہے۔

اگلا آدمی علی شیر تھا۔ کوئی تیس بتیس سال عمر ہوگی۔

بھائیو! ابھی بہاول نے جو کہانی سنائی، وہ جھوٹ تھوڑی تھی۔ اس طرح کا واقعہ میں نے اپنے دادے سے سنا تھا۔ بہاول نے یہ نہیں بتایا کہ اس چھوہری کو اپنا بھائی رب نواز کے پاس لایا تھا۔ دولت جھولی بھر بھر کر مل رہی ہو تو بھائی کو دلال بننے میں دیر نہیں لگتی، اور بہن کو ایک رات کی کنوی بننے میں حرج

محسوس نہیں ہوتا۔ خیر، بھائیو! میں بھی ایک بھائی کی کہانی سناتا ہوں۔ دل تھام کے بیٹھو۔ جگر پر ہاتھ دھرلو۔ یہ کہانی نہیں، سچ ہے۔ جھوٹ نہیں، حق ہے۔ کہانی وہی اچھی جو سننے والوں کے ہوش بھلا دے۔ کب رات ہوئی، کب دن چڑھا۔ تو سنو، مہربانو، قدردانو۔ تین بھائی تھے۔ ایک ڈاکو، ایک حکیم، ایک امام مسجد۔ تینوں میں اتفاق تھا۔ تینوں اپنی کمائی ایک جگہ رکھتے تھے۔ باپ مرکھپ گیا تھا، ماں زندہ تھی۔ بہن تھی کوئی نہیں۔ ساری کمائی ڈاکو کے پاس ہوتی تھی۔ حکیم اور امام مسجد کا خیال تھا، وہ دوسروں کے پیسوں پر ڈاکے ڈالتا ہے، پر بھائیوں کے پیسے پر نہیں۔ ایک دن ڈاکو نے کہا۔ کل ہم تینوں ایک جیسی چیزیں لائیں گے۔ اگر ہمارا خون ایک ہے تو ہم تینوں ایک جیسی چیزیں لائیں گے۔ حکیم اور امام مسجد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ثابت کرنا تھا کہ وہ حرام کا نطفہ نہیں ہیں۔ آج تک ساری دنیا سمجھتی آئی تھی کہ تینوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ پر اب ایک دوسرے کو ثابت کرنا تھا۔ دونوں کو کلکھ سمجھ نہ آئی۔ ماں کے پاس گئے۔ مدعا بیان کیا۔ بھائیو، سوچو بی بی نے کیا کہا ہوگا؟ بی بی نے انھیں ایک قصہ سنایا۔ ایک طوطے کی چونچ ٹوٹ گئی۔ حکیم کے پاس گیا۔ حکیم نے کہا جاؤ پہلے ٹوٹی ہوئی چونچ لے آؤ۔ غریب طوطے نے جنگل چھان مارا۔ چونچ کہاں ملنی تھی۔ حکیم کے پاس دوبارہ گیا۔ حکیم نے کہا، اس طوطے کی چونچ کیسے ٹھیک کی جاسکتی ہے، جو نہ اس کی حفاظت کر سکے، نہ ٹوٹے ہوئے حصے کو تلاش کر سکے۔ دونوں بھائیوں نے پوچھا، طوطے نے کیا جواب دیا۔ ماں بولی: وہ چپ چاپ واپس آگیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی ناک پر ایک ساتھ ہاتھ پھیرا۔ حکیم بیٹے نے کہا، ماں میں سمجھ گیا۔ رات ہوئی۔ تینوں بھائی اکٹھے ہوئے۔ ڈاکو نے پوچھا کیا لائے ہو؟ دونوں بھائیوں نے کہا، پہلے تم بتاؤ۔ ڈاکو نے کہا، جو کچھ بھی لائے ہو، اپنی ہتھیلیوں پر رکھو، میں دیا بجھادوں گا۔ جب تم ہتھیلیوں پر چیز رکھ چکو گے تو دیا

جلاؤں گا۔ مہر عباس، جاگتے ہو! بھائیو، میری عرض سن رہے ہو۔ سب نے ایک ساتھ کہا، علی شیر آگے بتاؤ، کیا ہوا؟ بھائیو، جب دیا جلایا گیا۔ تینوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تینوں نے ڈر سے کانپتے ہوئے، آنکھیں کھولیں۔ تینوں کی ہتھیلیوں..... پر کچھ نہیں تھا۔ حکیم صاحب بولے، ٹوٹی ہوئی چونچ جنگل سے نہیں ملتی۔ تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ لیکن بھائیو، جو بات ان تینوں بھائیوں کو سمجھ نہیں آئی، وہ یہ تھی کہ تینوں کا باپ تو ایک ہی شخص تھا، مگر وہ نہیں جو مرکھپ گیا تھا، وہی حکیم تھا، جس کے پاس ٹوٹی چونچ لے کر طوطا گیا تھا!

سننے والوں پر جیسے بم گرا ہوا۔ ایک بار پھر ڈر گئے۔ ایک بولا، ایک عورت اتنی بری کیسے ہوسکتی ہے؟ دوسرا بولا، بری تھی تو بیٹوں میں سے ایک ڈاکو بنا، دوسرا حکیم، دونوں لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ لیکن ایک تو امام مسجد تھا۔ ایک شخص نے جواباً کہا، وہ ماں کے گناہوں کا کفارہ تھا، ماں ہی نے تو اسے حافظ قرآن بنایا ہوگا۔ تین بھائی حرامی نہیں ہوسکتے۔ ایک شخص نے گویا فیصلہ دیا۔ یہ سنتے ہی علی شیر نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ بڑا جھوٹ وہی ہوتا ہے، جس کا لوگوں کو یقین نہ آئے۔ شہری، میں تو سخت الجھن میں ہوں، یہ لوگ جھوٹی کہانیاں نہیں سنا رہے، بڑی گہری باتیں کر رہے ہیں، اور ایک بے چینی پیدا کر رہے ہیں۔ سوچو، کیسا ہو اگر سب بیٹوں کو اپنے اصلی باپ کی تلاش ہو۔ مجھے بھی ایک کہانی سوجھی ہے، یہاں نہ سنادوں۔ بڑا زبردست خیال ہے۔ سنو گے۔ ہاں جلدی بولو۔ ''ایک بستی ایسی ہے، جس کے سب بیٹے، بیٹیوں کو شک ہے کہ ان کے باپ وہ نہیں جو انھیں بتائے گئے ہیں۔ وہ سب اپنے باپوں کی تلاش میں ہیں۔ اس بستی میں کسی کا باپ موجود نہیں ہے۔ وہ دوسری بستی جاتے ہیں، وہاں کے لوگ بھی اپنے باپ کی تلاش میں ہیں۔ دونوں کو لگتا ہے کہ ایک بستی کے سارے باپ، دوسری بستی میں ہیں۔ اس پر تمام بیٹے، بیٹیوں میں جنگ ہوتی ہے، سب ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ان کی لاشوں پر بیٹھ کر دونوں بستیوں کے باپ جشن مناتے ہیں، جھوٹ کا جشن!'' واہ، واہ، کتنا بڑا جھوٹ، کتنی زبردست کہانی۔ یار، کیسی عجیب بات ہے، زبردست جھوٹ ہی، زبردست کہانی ہوتا ہے۔ تم تو پیدائشی کہانی کار نظر آتے ہو۔ انجینئرنگ میں غلط گئے۔ شکریہ، شکریہ۔ بس یہ اس فیسٹول کا اثر ہے۔ ابھی ہم

مند ہو سکتی ہے؟ کسی نے کہا۔ جب مرد نامرد ہو جائیں تو عورتیں مرد بن جاتی ہیں۔ کسی نے رائے دی۔ 'سوانیاں دا پنڈ' کا قصہ کچھ اور ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ کوئی کہنے لگا۔ بالکل صحیح، نصیر خاں بولا۔ بھائیو، تم جھوٹ کے قصوں میں ایک دم سچ کیوں ڈھونڈنے لگ جاتے ہو۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا، مگر سب بولے چلے جا رہے تھے۔ میں واش روم جانے کے لیے اٹھا۔ پھاٹک کے دائیں جانب واش روم تھا۔ یہ بھی نئی تبدیلی تھی، پچیس سال پہلے گاؤں میں کہیں واش روم نہیں ہوا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے پھاٹک سے باہر گیا۔ ٹانگیں تھک گئی تھیں۔ چند منٹ ادھر ادھر چلا۔ ٹیوب ویل کے ساتھ درختوں کا جھنڈ، کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ کومڑ کی جگہ دھندلے خاکے نے لے لی تھی۔ صبح کاذب ہو رہی تھی۔ کئی سالوں بعد میلوں تک پھیلے کھیتوں میں صبح کے ہونے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے آرٹ کی ایک قدیم، عظیم الشان کتاب کا ایک صفحہ کھل گیا ہو۔ اصل فیسٹول تو یہ ہے جو نامعلوم زمانوں سے جاری ہے! میرے منھ سے بے اختیار نکلا۔

واپس آیا تو وہی آدمی کھڑا ہوا تھا، جس نے مقابلے کا آغاز کیا تھا۔ بولا، بھائیو، چپ کرو۔ جھوٹ بولنے میں سب جائز ہوتا ہے۔ جھوٹ کی کوئی حد نہیں۔ بس یہ سمجھو بھائیو، جھوٹ کا کوئی دین مذہب نہیں۔ یہ سب جھوٹ جو تمھارے آگے بولے گئے، تم سب کو خوش کرنے کے لیے تھے۔ تم نے الہ دین کے چراغ کا سنا ہوگا، جھوٹ وہی چراغ ہے۔ بس رگڑا اور ہر چیز حاضر۔ لیکن بھائیو، کوئی جھوٹا آدمی برا نہیں ہوتا۔ برا بننے کے لیے عمل کرنا ضروری ہے۔ اس بات پر سب ہنس پڑے۔

یار یہ کیسی عقل مندی کی باتیں کر رہا ہے؟ میں نے پھر سرگوشی کی۔

گاؤں کے ایسے لوگوں کو طنز سے گامن سچیار کہتے ہیں۔ اس کا قصہ تو تم نے سنا ہوگا۔ شہریار بولا۔

ہاں وہی چھت پر ہانڈی اور نیچے آگ والا، اور دور سے آگ دیکھ کر ساری رات ٹھنڈے تالاب میں رات گزارنے والا۔ میں نے جلدی جلدی کہا۔

شکر ہے، شہر جا کر کچھ تو یہاں کی باتیں بھی یاد رکھی ہیں۔ شہریار نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔

صبح کاذب رخصت ہو رہی تھی۔ سب لوگوں کو چار مرتبہ چائے پیش کی جا چکی تھی۔ کچھ کو

بھنگ اور چرس بھی دی گئی تھی۔ ایک آدھ نے شراب سے بھی شوق کیا۔ میں نے باقی کہانیاں توجہ سے نہیں سنیں۔ سوتا جاگتا رہا۔ مجھے اشتیاق تھا کہ آخر میں مہر عباس کس کہانی کو انعام دیتے ہیں، اور کیا کہتے ہیں۔ بالآخر، وہ لمحہ بھی آ گیا۔ اس آدمی نے اعلان کیا کہ اب مہر عباس اپنا فیصلہ سنائیں گے، اور اور بھائیو اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہوگا۔ میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔

مہر عباس نے بولنا شروع کیا۔

آپ سب نے یہ باتیں سنیں، یہ جھوٹ سنے، یہ کہانیاں سنیں۔ میرا مقصد آپ سب بھراؤں کو خوش کرنا ہے، اور باتیں کرنے کے فن کو زندہ رکھنا ہے۔ یہ فن مرتا جا رہا ہے۔ لڑائی بھڑائی کے فنوں نے بہت ترقی کی ہے، مگر بھائیو باتیں بنانا ایک بڑا فن تھا، اسے لوگ بھول بھال گئے ہیں۔ لڑائیاں تو ان قصوں کہانیوں، جھوٹ موٹ کی باتوں میں بھی ہوتی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ جب تک جھوٹ موٹ کے قصوں کی لڑائیوں میں لوگ دل چسپی لیتے تھے، اصل لڑائیوں سے دور رہتے تھے۔ دوسروں کو لڑتے سن دیکھ کر ان کے لڑنے کی خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ بھائیو، باتوں کا فن ہر بندے کے بس کا روگ نہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس بار جھوٹ کا موضوع کیوں رکھا گیا۔ میرے بھائیو، ہم سب جھوٹ بولتے ہیں۔ کوئی چھوٹا جھوٹ بولتا ہے، کوئی بڑا۔ میں نے سوچا یہ دیکھیں کہ کوئی شخص کتنا بڑا جھوٹ بول سکتا ہے، اور جھوٹ سے کتنی اچھی کہانی گھڑ سکتا ہے، پھر تم سب کو کیسے خوش کر سکتا ہے۔ کسی کو خوش کرنا نیکی ہے۔ بھائیو، ہر کام صلاحیت سے ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے کے لیے بھی صلاحیت چاہیے، لیکن یہ وہی صلاحیت ہے جو سچ بولنے کے لیے ہے۔ سچ اگر ہتھیلی ہے تو جھوٹ اس کا پچھلا حصہ ہے۔ جنھوں نے ہتھیلی کا تھپڑ اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ کھایا ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ الٹے ہاتھ کا درد زیادہ ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا، جب کہانی ختم ہوتی تھی، تم لوگ یہی الٹے ہاتھ کا تھپڑ اپنے منھ پر محسوس کرتے تھے۔ ہر بڑے جھوٹ میں ہمارے بڑے بڑے سچ ہو سکتے ہیں۔ تو بھائیو، یہ جھوٹ کا فیسٹول، بڑے سچ کا جشن ہی سمجھو۔ آپ سن کے حیران ہوں گے کہ میں نے اس مقابلے سے پہلے لوگوں کا ٹرائل لیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کے سامنے جھوٹی موٹی کہانیاں سنائی ہیں، انھوں نے ٹرائل میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مجھے کچھ جھوٹ یاد رہ گئے ہیں، دل چسپ ہیں، آپ بھی سن لیں۔ (اس دوران موت جیسی

خاموشی رہی۔ مہر عباس کا رعب سب پر تھا۔ پر میں حیران تھا کہ ایک دیہات کا زمیندار اتنی عقل کی باتیں کیسے کر رہا ہے، جس کا جواب مجھے بعد میں شہر یار سے ملا۔)

ایک عورت کے دس شوہر ہیں۔

ایک جگہ رہنے والے لوگوں کے پانچ پانچ سر ہیں۔

ایک آدمی ایسا ہے جس کی چار آنکھیں ہیں، اسے کسی نے نہیں دیکھا، مگر وہ اس کونے سے اس کونے تک ہر ایک کو دیکھتا ہے۔

ایک بلا ایسی ہے، جو رات کو ایک بستی کے تمام انسانوں کا خون پی جاتی ہے، صبح الٹی کرتی ہے تو خون لوگوں کی رگوں میں واپس آجاتا ہے۔

ایک آدمی دن میں مرد اور رات میں عورت ہوتا ہے۔ اس نے ایک رات بچے کو جنم دیا۔

ایک آدمی نے ایک روٹی بنائی، جسے پانچ سال سے ایک ملک کے لوگ کھا رہے ہیں، مگر وہ ختم نہیں ہوتی۔

دنیا میں ایک ایسا ملک ہے جہاں بہتر فرقوں کے مولوی آپس میں کبھی نہیں لڑے۔

ایک ایسا جنگل ہے جہاں کی چیونٹیوں کے انڈوں سے شیر کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

یار یہ جھوٹ ہیں یا پہیلیاں؟ ویسے ان میں سے کوئی بات سو فیصد جھوٹ نہیں۔ میں نے شہر یار سے سرگوشی کی۔ سب کچھ ممکن ہے، کچھ حقیقت میں، کچھ دوسری طرح سے، کیا کہتے ہیں اسے، ہاں علامتی طور پر۔ کچھ ابھی ممکن ہے، کچھ کسی اور وقت پر۔ چپ رہو، مہر عباس برا مانیں گے۔ شہر یار نے ڈانٹا۔

آپ سب یہ سن کر ہنسے ہیں۔ مجھے اس سارے کھکھیڑ کی قیمت موصول ہوگئی ہے۔ آپ یہ بھی جاننا چاہتے ہوں گے کہ آج کے ونر کون ہیں تو بھائیو، اس دفعہ تین ونر ہیں۔ بہاول، علی شیر اور نصیر خاں۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ تینوں کو انعام ملے گا، اور ابھی۔ تینوں نے باری باری نقد رقم، شیلڈ، پگڑی وصول کی، گائیں تینوں کو صبح دینے کا وعدہ ہوا۔

ہم دونوں نے مہر عباس سے ہاتھ ملایا، اور اجازت چاہی۔ وہ پھاٹک تک ہمارے ساتھ

آئے، اور رخصت کرتے ہوئے کہنے لگے۔ بھائی صاحب اس الیکشن پر آپ نے ووٹ ڈالنے ضرور آنا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ووٹ کاسٹ نہیں کرتے اور پھر کہتے ہیں کہ ملک کی قسمت نہیں بدلتی۔ میں نے انشاءاللہ کہا، اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔

کیا تمھیں مہر عباس سمجھ آئے؟ گاڑی میں بیٹھتے ہی شہر یار نے کہا۔

معقول آدمی ہیں۔ میں نے قدرت کے آرٹ کے نمونے کے لیے، جس میں سفید رنگ شوخ ہو چلا تھا، اور کناروں پر لالی نمودار ہو رہی تھی، دل میں احترام و تقدیس کے گہرے جذبات محسوس کرتے ہوئے، جواب دیا۔

معقول تو ہیں، پیسہ اور لوگوں کو بنانے کے ماہر بھی۔ شہر یار بولا۔

وہ کیسے؟ میں تو انھیں ایک بڑا زمیندار سمجھتا ہوں۔

وہ تو ہیں، مگر اب زمینداروں نے پیسہ کمانے کے دوسرے طریقے بھی سیکھ لیے ہیں۔

میں سمجھا نہیں۔ مجھے تجسس ہوا۔

مہر عباس لندن پڑھنے کے لیے گئے تھے۔ خدا جانے کیا پڑھا، تم نے دیکھا نہیں کیسی عقل مندی کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بڑے گھاگ ہیں۔ جانتے ہیں کہاں کیا کیا بکتا ہے۔ دیہاتیوں کے سامنے عقل مندی کی باتیں کریں گے، جو انھیں سمجھ نہیں آئیں گی تو ان کے رعب میں مزید اضافہ ہوگا۔ یہاں عقل نہیں چلتی، شخصیت کا رعب چلتا ہے۔ تھانے کچہری سے لے کر الیکشن میں کامیابی اسی رعب سے ملتی ہے۔ مہر عباس ایک طرح کے مولوی ہیں۔

مولوی؟ میں چونکا۔

پورے مولوی نہیں، ایک لحاظ سے مولوی ہیں۔ شہر یار نے گاڑی آہستہ کرتے ہوئے کہا، آگے نہر کا پل تھا، اور عرصے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو، مولوی دیہاتیوں کے سامنے جب بڑے بڑے فقیہوں کی کتابوں سے عربی عبارتیں پڑھتا ہے تو سامنے بیٹھے غریب دیہاتیوں کو خاک سمجھ نہیں آتیں، مگر مولوی کا رعب بہت پڑتا ہے۔

رعب مولوی کا، یا اس کی عربی کا؟ میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں کا۔ مولوی سے اگر یہ کہا جائے کہ تم نے ساری دعائیں پنجابی میں مانگنی ہیں، اور خطبے میں جو کچھ کہنا ہے، صرف پنجابی میں کہنا ہے تو یقین کریں کوئی اس کی بات توجہ سے نہ سنے۔ شہر یار نے کہا اور جماہی لی۔ ساری رات جاگنے سے تھکان اس کے چہرے سے عیاں تھی، مگر ذہن تازہ دم محسوس ہوتا تھا۔

مجھے یاد آیا، ہماری فرم میں ایک مصری عربی کام کرتے تھے۔ شروع شروع میں وہ عربی میں گالی دیتے تھے تو ہم سب سبحان، اللہ سبحان اللہ کہتے تھے، بعد میں وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتاتا کہ اس نے ہماری ماں بہن ایک کردی تھی۔ اس کے بعد وہ کوئی مقدس آیت بھی پڑھتے تو ہم ہونکوں کی طرح اس کا منہ دیکھتے رہتے۔ میں نے کہا۔

میں نے پولیٹکل سائنس کی انگریزی میں کتابیں نہیں پڑھیں، مگر یہاں کی سیاست کی پوری سائنس پڑھی ہے۔ جو شخص، کسی بھی وجہ سے لوگوں کو ہونق بنا دے، اور لوگوں کو سمجھ نہ آئے کہ وہ اس کی تعریف کریں یا بد تعریفی۔ لوگ اسے دیکھتے اور سنتے ہوئے گومگو کی حالت میں ہوں، اور اس حالت پر رعب کا غلاف ہو، تو وہ شخص سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ شہر یار نے کہا۔

اس وطن میں دو ہی زبانوں کا رعب ہے، انگریزی اور عربی کا۔ جسے یہ آتی ہیں، اسے لوگوں پر حکومت سے کوئی نہیں روک سکتا۔ دونوں لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ میں نے خیال آرائی کی۔

آج کا جھوٹ کا جشن بھی، حکومت کے لیے ہوگا۔ شہری، کیا ایسا تو نہیں کہ مہر عباس اور مولوی میں کوئی گہرا تعلق ہے؟ میں نے پوچھا۔

بالکل۔ الیکشن ہوں گے تو یہاں کے سارے بریلوی مولوی، مہر عباس کا ساتھ دیں گے۔ شہر یار نے میرے علم میں اضافہ کیا۔

لیکن ان کا نام تو شیعوں والا ہے۔ میں حیران تھا۔

دیہاتوں میں ابھی تک نام شیعہ سنی ہونے سے بچے ہوئے ہیں۔ ویسے ہر شے کو شیعہ سنی بنانے کی بہت کوشش ہوئی۔ ان کا بس چلے تو جگہوں، جانوروں، پرندوں، درختوں کو بھی شیعہ سنی بنائیں۔ ویسے اگر کبھی ایسا ہوا تو گھوڑا شیعہ ہوگا' اونٹ سنی۔ میں نے لقمہ دیا۔ شہر یار مسکرایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ایک زمانے میں تمام شہروں، قصبوں کو مسلمان بنایا گیا تھا، اب ہر شے کو شیعہ سنی بنانے کا عمل

جاری ہے۔ ویسے مہر عباس بریلوی ہیں۔ دیہات میں ہر الیکشن کے موقع پر شیعہ سنی ضرور مسئلہ اٹھتا ہے۔ مہر عباس کو کوئی شیعہ ووٹ نہیں دے گا، خواہ وہ پیپلز پارٹی میں چلے جائیں۔ خیر، مہر عباس اب بھی باہر بہت جاتے ہیں۔ مجھے ان کے ایک خاص آدمی نے بتایا۔ یہ جو جھوٹ کا مقابلہ تھا، یہ صرف شوق نہیں تھا۔ تم شہر میں رہتے ہو، مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اب ہر شے بکتی ہے۔ یہ کہانیاں بھی بیچی جائیں گی۔ تم نے دیکھا نہیں ہر کہانی ریکارڈ ہو رہی تھی۔

کہانیاں کیسے اور کس کو بیچی جائیں گی؟ میں متجسس ہوا۔

بھائی یہ مجھے نہیں پتا، مگر میں نے سنا ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ ہوگی جہاں ہمارے آم، سنگترے بک سکتے ہیں، پڑھے لکھے لوگ بک سکتے ہیں تو کہانیاں کیوں نہیں؟ شرط یہ ہے کہ آموں کی طرح تمھاری شہری زبان میں نیٹو ہوں۔ شہر یار نے دانش وری بگھاری۔

یار میں تو تمھیں دیہاتی سمجھا تھا، بی۔ اے کے بعد تم یہیں اپنا چھوٹا موٹا زمیندارہ کرتے رہے ہو، تم کافی سمجھ داری کی باتیں کرنے لگے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میری دل چسپیاں دو ہی تو ہیں، اخبار اور یہاں کی مقامی سیاست۔ شہر یار نے فخر محسوس کرتے ہوئے کہا۔ مہر عباس کو ایم این اے بننے کے لیے کروڑوں روپے اور باہر کی سپورٹ چاہیے۔

مجھے یاد ہیں تمھاری دل چسپیاں۔ راہ میں پڑا پرانا اخبار بھی اٹھا کر چاٹ جاتے تھے۔ مجھے یاد آیا، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جھوٹ وہی آدمی بولتا ہے، جسے اپنی زبان اچھی طرح آتی ہو۔ اسی لیے بچے، جو ابھی زبان سیکھ رہے ہوتے ہیں، جھوٹ کم ہی بولتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوا کہ جھوٹ بول کر کوئی شخص، یہ بتاتا ہے کہ وہ کہاں تک سوچ سکتا ہے، اور کیا کیا کچھ کہہ سکتا ہے۔ خوب، ہم کہاں تک سوچ سکتے ہیں، اور کیا کیا کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ ان کہانیوں سے جانیں گے۔ وہ ہمارے جھوٹ سے، ہمارے سچ تک پہنچیں گے۔ یار یہ سب تو بہت دل چسپ ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جسے ہم جھوٹ کہتے ہیں، وہ اندر سے خالی نہیں ہوتا۔

دل چسپ تو ہے۔ اسی لیے تو تمھیں لے گیا۔ شہر یار نے کہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ سادہ لوح دیہاتیوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی، وہ ایک

اعلیٰ ساہیوال نسل کی گائے کی خاطر کیا کچھ دے گئے ہیں۔ شہر میں کہتے ہیں، یہ کارپوریٹ دنیا ہے۔ مہر عباس ایک تیر سے کئی شکار کرتا ہے۔ لوگوں کو خوش کرتا ہے، تفریح، کھانوں اور انعامات سے، اور خود عزت، شہرت اور دولت سمیٹتا ہے۔ میرا خیال تھا، یہ سب شہروں میں ہوتا ہے۔

میری جان، اب شہر ہر دیہات میں گھس آئے ہیں۔ شہر اور دیہات کا جو مکالمہ ہم سکول کے امتحانوں میں لکھتے تھے، وہ اب خیالی بات ہے۔ دیکھو یہاں اب کیبل، موبائل فون، نیٹ، سب کچھ ہے۔ ایک زمانے میں دیہات میں بجلی آجاتی تھی تو لوگوں کو کئی کئی مہینے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ٹی وی دیکھ سکتے ہیں، اور راتوں کو بلب کی روشنی میں تاش کھیل سکتے ہیں۔ شہر یار نے گاڑی میرے گھر کے پاس روکتے ہوئے کہا۔ صبح ہو چکی تھی، اور لوگ نماز پڑھ کر واپس آرہے تھے۔

میں نے اترنے سے پہلے کہا۔ ہاں شہر یار۔ شہروں نے دیہاتوں کو نگل لیا ہے۔ بس دریاؤں کے کنارے، جہاں ابھی سیلاب کے خطرے ہیں، وہاں کچھ کچھ دیہات ہیں، جیسے مہر عباس کا ڈیرہ۔

وہ دیکھنے میں دیہات ہے، ورنہ وہاں وہی سیاست ہوتی ہے جو روزانہ ٹی وی ٹاک شو میں سنتے ہو۔ شہر یار نے میرے ساتھ گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

ابھی تک میرے ذہن میں یہ بات اٹکی ہے کہ مہر عباس کس کو کہانیاں بیچیں گی، اور کوئی کس لیے خریدے گا۔ میں نے کہا۔

میں نے بھی اس پر کافی سوچا، پھر مجھے بی اے میں تاریخ کی پڑھی ہوئی ایک کتاب یاد آئی۔ اس میں لکھا تھا کہ انگریز کے زمانے میں بھی یہاں دیہات کی کہانیاں جمع کی گئی تھیں۔ اس زمانے میں پٹواریوں کے ذمے لگایا گیا کہ وہ لوگوں سے کہانیاں سنیں، اور لکھ کر لائیں۔ شاید ٹمپل اس کا نام تھا۔ اس نے اپنے نام سے چھپوائیں۔ اسی طرح کی کہانیاں پڑھ کر انگریز نے کہا کہ یہاں ٹھگ، چور، جھوٹے، خوشامدی، غدار، حرام جانوروں کا گوشت کھانے والے رہتے ہیں۔ دفتروں کے چپراسیوں اور سانسیوں کو دیکھ کر انھوں نے سب کو ایسا کہہ دیا۔ ہو سکتا ہے، ان گوروں کو لگتا ہو کہ اب ہم کچھ بدل گئے ہیں، اور وہ ہم سے نئی کہانیاں سن کر ہمیں جاننا چاہتے ہوں۔ شہر یار نے واقعی دانش وری ظاہر کی، اور اپنی بات جاری رکھی۔ یہ تو تمھیں پتا ہے، اب کہانیاں سنانے کی محفلیں میلوں ٹھیلوں میں

نہیں ہوتیں، زیادہ سے زیادہ کسی میلے میں ہیر گائی جاتی ہے۔ اب ایک ہیر کو کہاں تک بگھارا جائے؟ پہلے سب میلوں میں قصے کہانیاں سنانے والے ہوتے تھے۔ کیبل اور انٹرنیٹ نے سب ختم کر دیا۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کہانیوں کے خریدار یہیں کہیں موجود ہوں، اور مہر عباس کو ان کی سپورٹ بھی چاہیے ہو۔ میں نے خیال آرائی کی۔

ہونہہ۔ ایسا بالکل ممکن ہے۔ تم بھی یہاں کی سیاست کی سائنس ایک رات میں سمجھ گئے ہو۔ شہر یار نے مجھے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

لیکن جھوٹ کا فیسٹول کیوں؟ میرے دماغ کی سوئی مسلسل اسی پر اٹکی تھی۔

کیوں کہ اس میں اٹریکشن ہے۔ جھوٹ میں بھی اور فیسٹول میں بھی۔ خرید نے بیچنے کے لیے اٹریکشن پہلی شرط ہے۔ شہر یار نے اپنے تجزیے پر فخریہ انداز میں کہا۔

یار اگر جھوٹ میں اتنی اٹریکشن ہے تو جاتے ہوئے ہم بھی ایک ایک جھوٹ بولیں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رات ہم کہیں نہیں گئے۔ شہر یار رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا! مجھے کالج کے زمانے کا یاد کیا ہوا ایک مصرع یاد آگیا۔

■•◆•◆•◆•■

مرنے کے بعد مسلمان ہوا جا سکتا ہے؟

"مولبی صاحب، میرے بچڑوں کے لیے دعا کر دو"۔

وہ کئی مہینوں سے دعا کروانے آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کبھی مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوتے، کبھی مسجد سے ملحق اپنے گھر میں۔ وہ عموماً عصر کے بعد آتی۔ اور لوگ بھی دعا تعویذ کی خاطر موجود ہوتے۔ زیادہ تر بیمار بچوں کی مائیں ہوتیں۔ ری ری کرنے والے سال دو سال کے بچوں کے لیے مولوی صاحب کا دم کیا ہوا دھاگہ گاؤں بھر میں مشہور و مقبول تھا۔ ماؤں کو یقین تھا کہ جوں ہی دھاگہ بچے کے گلے میں ڈالا جائے گا، بچہ چپ کر جائے گا۔ کچھ عورتوں کو وہم ہوتا کہ ان کے بچوں کے سر بڑھ رہے ہیں، مولوی صاحب کدو دم کر دیتے تھے، جیسے جیسے کدو خشک ہوتا، مائیں یقین کرنے لگتیں کہ بچے کے سر کا بڑھنا رک گیا ہے۔ ادھر بچوں کے سر بڑھنا رکتے، ادھر مولوی صاحب کے پاس بچوں کی ماؤں کی تعداد بڑھتی۔ ہر بچے کی ماں اس وہم میں بھی مبتلا ہوتی کہ اس کے بچے کو 'نظر' لگ گئی ہے، اس لیے اس نے چلنا شروع نہیں کیا، اماں ابا سے آگے کوئی لفظ نہیں بول رہا، بے وجہ رات رات بھر روتا ہے، اکثر بیمار رہتا ہے۔ مولوی صاحب بچے کو دم رکھتے، یا تعویذ دیتے۔ گاؤں کی عورتیں، بچوں کے لیے اتنا ڈاکٹروں کے پاس نہیں جاتی تھیں، جتنا مولوی صاحب کے پاس آتی تھیں۔ گاؤں میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا، جس میں مولوی صاحب کا کوئی نہ کوئی عقیدت مند موجود نہ ہو۔ عورتیں لڑائی جھگڑوں، پیسوں کی چوری، بیماری وغیرہ کا حساب کروانے بھی آتیں۔ کبھی تو ایک ہی گھر سے پہلے ساس تعویذ لے جاتی، جسے یقین ہوتا کہ اس کے بیٹے اور خاوند پر جادو کیا گیا ہے، اور کچھ دیر بعد بہو آتی، جو اس بات سے

پریشان ہوتی کہ کسی نے اس کے شوہر پر جادو کیا ہے۔ گھر میں جن بھوت کا شک ہے تو مولوی صاحب سے رجوع کیا جاتا۔ مولوی صاحب سب کی خیر مانگتے۔

گاؤں کے ڈاکٹر کے برعکس مولوی صاحب کی فیس مقرر نہیں تھی، مگر کچھ نہ کچھ دینا لازم تھا۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ اگر ڈاکٹر اپنے علم کا معاوضہ لے کر بھی انسانیت کی خدمت کرنے والا کہلا سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں۔ اس کے پاس بھی تو علم ہے، جس سے لوگوں کو شفا ملتی ہے، اور ان کی مشکلات دور ہوتی ہیں۔ دو ایک مرتبہ تو دو ایک مریضوں کو ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا، وہ مولوی صاحب کے تعویذ سے ٹھیک ہو گئے۔ اس سے مولوی صاحب کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ مولوی صاحب اکثر ڈاکٹر سے اپنا موازنہ کرتے رہتے تھے، اور دل ہی دل میں اس بات کا حساب لگایا کرتے تھے کہ ایک دن میں ان کے پاس کتنے لوگ آئے، اور ڈاکٹر کے پاس کتنے۔ کچھ کچھ پیسوں کا حساب بھی لگا لیتے۔ مگر یہ سب سوچتے ہوئے، وہ پورے خلوص سے شکر کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے کلام کا علم دیا، جس میں ہر ایک کے لیے شفا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے مدرسے کے استاد حافظ شریف کو بھی یاد کر لیا کرتے، جنھوں نے پیار، ڈانٹ، سزا، شاباش سے انھیں اس قابل بنایا۔

وہ جب بھی آتی، کچھ نہ کچھ لے آتی۔ حالاں کہ خود وہ مانگ کر لاتی تھی۔ شروع شروع میں اس نے مولوی صاحب کو آٹا، چاول، گندم، دالیں، روٹی بھی لا کر دی، مگر تیسری چوتھی مرتبہ مولوی صاحب نے سخت ناراضی کے بعد منع کر دیا کہ وہ کم از کم اس سے یہ چیزیں قبول نہیں کریں گے۔ وہ سمجھ گئی۔ مولوی صاحب کمائی ہوئی چیز چاہتے تھے، مانگی ہوئی نہیں۔ اب وہ کبھی دو روپے، کبھی پانچ روپے، کبھی دس روپے لاتی۔ وہ اور مولوی صاحب دونوں جانتے تھے کہ روپیہ ایسی چیز ہے، جس کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ مانگ کر لایا گیا ہے، کما کر، چرا کر، یا چھین کر۔ جس کے پاس ہے، اسی کا ہے۔

اس میں جھجک، ڈر، انکسار، ادب جمع ہو گئے تھے، جن کا اظہار اس کی التجا میں ہوتا۔ اس کے جملے کے لفظوں سے زیادہ، وہ منکسر، ڈرا ڈرا، مؤدب لہجہ متاثر کن تھا، جسے اس کی گوت کے لوگوں نے صدیوں قرنوں کی 'تپیا' سے حاصل کیا تھا۔ آج بھی عصر کے بعد وہ آئی تھی، اور باقی

سب عورتوں سے الگ، دور بیٹھک کے ایک کونے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ سب سے آخر میں، اذان مغرب سے ذرا پہلے، اس کی باری آئی۔ وہ گھسٹتے ہوئے، مولوی صاحب تک پہنچی۔ اس نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا، اور ایک میلا، مڑا تڑا پانچ کا نوٹ مولوی صاحب کے قدموں میں نہایت ادب سے رکھا، جو اپنی مخصوص چٹائی پر اپنے گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ عموماً مولوی صاحب دعا کر دیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی پانی، دودھ، شربت وغیرہ بھی دم کر دیا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ اس کی التجا سنتے ہی چڑ گئے۔ وہ کئی مہینوں سے خود پر ضبط کیے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر انھیں گاؤں کے ڈاکٹر کا خیال آیا کرتا تھا، جس کے پاس ایک مریض چھ ماہ پڑا رہا، مگر ٹھیک نہ ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اس کے پاس مریضوں کی تعداد کم ہونے لگی ہے۔ وہ مریض کے لواحقین پر برس پڑا۔ مریض خاک ٹھیک ہوگا، اگر اسے ٹھیک دوا ہی نہ دی جائے گی۔ لے جاؤ اسے گھر۔ مولوی صاحب کو آج بھی یہ خیال آیا اور ان کا ضبط ختم ہو گیا۔

''تم کیسی عورت ہو، داکدار کے پاس بھی جاتی ہو، اور اللہ میاں کے پاس بھی آتی ہو''؟

''مولبی صاحب.....'' عورت لاجواب سی ہو گئی، اور خود کو کسی نامعلوم طاقت کے آگے بے بس محسوس کیا۔

''دیکھو، تم ابھی ایک فیصلہ کرو۔ تمھیں اللہ پر یقین ہے، یا داکدار پر؟ اگر اللہ کو وحدہ لاشریک مانتی ہو تو کسی اور کی مدد مت مانگو... جانتی ہو شرک کیا ہوتا ہے''؟

(خاموشی کا ایک جان لیوا وقفہ)۔ عورت کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''شرک یہ ہے کہ خدا کو زبان سے، دل سے، ذہن سے، ہر عمل سے وحدہ لاشریک مانو''۔ مولوی صاحب نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جی''۔ اس نے صدق دل سے کہا۔

''شرک گناہِ کبیرہ ہے۔ جاؤ پہلے توبہ استغفار کرو۔ پھر آج کے بعد کسی حکیم، کسی داکدار کا خیال بھی نہ لاؤ، اپنی اس بے مغز کھوپڑی میں۔ اگر ان کے پاس جانا ہے تو میرے پاس مت آؤ''۔ مولوی صاحب نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔

''جی''.... وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگی تو مولوی صاحب کی آواز پھر گونجی۔

''تمھیں معلوم ہے، تمھارے سارے بیٹے گونگے' بہرے' معذور کیوں ہیں''؟ اچانک مولوی صاحب نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

اسے کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ چار معذور، لاچار بیٹوں کی ماں ہے، جن کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ انھیں مسلسل بخار رہتا اور ہر وقت کھانستے رہتے۔ اسے ان کا پیٹ بھرنا ہوتا، اور پیٹ کے راستے سے بننے والی غلاظتوں کو بھی صاف کرنا ہوتا۔ صبح شام گولیاں ان کے منھ میں ٹھونسنی ہوتیں۔ ہر دوسرے تیسرے روز مولوی صاحب سے کچھ نہ کچھ دم کروا کے لانا ہوتا۔ باقی سارا دن وہ گھر گھر جاتی، سر پر چھکو (چھابڑی) رکھے، کاندھے سے جھولا لٹکائے، ہاتھ میں ایک چھڑی لیے۔ رات کو بیٹھ کر وہ بچوں کے لیے رنگین کاغذوں سے توتیاں (بچوں کی نفیری) اور جھنجھیریاں بناتی، جنھیں صبح اپنے چھکو میں ڈال لیتی۔ غبارے وہ دکان سے خرید لاتی۔ ہر گھر کے دروازے پر دو تین مرتبہ چھڑی مارتی، جیسے اطلاع دینے کے لیے کوئی کھنکھارتا ہے، پھر بے کھٹکے گھر میں داخل ہو جاتی۔ بچے اسے دیکھتے ہی دوڑے دوڑے آتے۔ توتیوں اور جھنجھیریوں کے بدلے جو کچھ ملتا، اسے جھولے میں ڈالتی۔ کئی مرتبہ دھتکاری جاتی، مگر وہ اس کی عادی تھی، اور اسے اپنے پیشے کا لازمی حصہ سمجھ کر اس نے قبول کیا ہوا تھا، تاہم کبھی کبھی جب اسے کوئی دھتکار کے ساتھ دھکا دیتا، یا اچانک کوئی راہ چلتے اس سے لپٹ جاتا، اور خوشی خوشی اعلان کرتا کہ اب اس کی پچھل بہری ختم ہو جائے گی، تو اس کے دل پر چوٹ لگتی تھی، اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اونچی آواز میں موٹی موٹی گالیاں دے، جس طرح اس کا شوہر اسے دیا کرتا تھا۔ جب شام کو گھر پہنچتی تو اس کے جھولے، چھکو اور ہاتھوں میں بچا ہوا سالن روٹی، خشک آٹا، دال، چاول گندم یا روپے، چونی اٹھنی ہوتی۔

اس کا خاوند چوتھے بیٹے کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد مر گیا تھا۔ ہیروئن کا نشہ کرتا تھا اور موقع بے موقع اسے پیٹتا تھا۔ سارے دن کی کمائی چھین لیتا تھا، اور اسے اور بیٹوں کو ننگی گالیاں دیتا تھا۔ اسے ڈھڈو، چھنال، بدکار اور بیٹوں کو حرامی کہتا تھا۔ آج کس کس یار کے ساتھ سوئی ہو؟ روزانہ اس کا سواگت اس جملے سے ہوا کرتا۔ اس کا اپنے بارے میں علم بس یہیں تک محدود تھا۔ آٹھ سوکھی ٹانگیں،

اور ہر وقت کسی امید میں بھٹکتی مگر بجھی آٹھ آنکھیں اس کی دنیا تھیں؛ وہ اس دنیا سے باہر کچھ نہیں دیکھ پاتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی کبھی نہیں آیا کہ اس کے علم سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ اسے اگر کوئی خیال آتا تھا تو یہ تھا کہ کہیں، کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو آٹھ سوکھی ٹانگوں کو ہرا کر سکتی ہے۔ یہ خیال اس کا سب سے بڑا آسرا تھا، لیکن ساتھ ہی اس کی ایک پریشانی کا باعث بھی تھا۔ وہ اکثر اس بات پر پریشان ہوتی تھی کہ اتنا زمانہ گزر گیا، اسے وہ ہستی کیوں نہیں ملی۔ مگر ابھی مولوی صاحب کے سوال سے اس کی ڈھارس بندھی۔ اسے لگا کہ اس کی پریشانی دور ہونے والی ہے۔ اس نے پہلی بار نہایت غور سے مولوی صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ سفید چمک دار، ترشی ہوئی لمبوتری داڑھی، سانولا مگر روشن چہرہ، چوڑی پیشانی پر محراب، جھکی ہوئی آنکھیں۔

''اللہ کی بندی، تم میری بات سن رہی ہو''؟ مولوی صاحب گرجے۔

''جی... جی سن رہی ہوں''۔ وہ سہم گئی، اور پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

''تو سنو، تمھارے بیٹے اس لیے معذور ہیں کہ تم گناہ گار ہو..... ویسے تو ہم سب ہی گناہ گار ہیں۔ ہم گناہ کرتے ہیں اور سزا ہماری اولاد کو ملتی ہے''۔ مولوی صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا۔

اسے اپنے گناہ گار ہونے میں ذرا شک نہیں تھا، یوں بھی اس کا شوہر اپنے جیتے جی ہر شام اسے گناہ گار ثابت کیا کرتا تھا، مگر اسے ذرا سی حیرت ہوئی۔ اسے کسی بات میں شک نہیں تھا۔ اس میں کیا شک تھا کہ وہ کوئی چالیس سال ہوئے، ایک مصلی، چوہڑے کے گھر پیدا ہوئی؛ ایک مصلی سے اس کی شادی ہوئی، اس کے باپ نے بدلے میں پانچ ہزار روپیہ نقد لیا تھا؛ شادی سے پہلے کئی لڑکوں نے راہ چلتے ہوئے، سنسان گلی میں اس کی چھاتیوں کو ٹٹولا تھا، کچھ نے تو نیفے میں بھی ہاتھ ڈال کر ایک نازک مقام پر چٹکی بھر لی تھی، اور وہ سی کر کے رہ جاتی تھی اور تین لڑکوں سے وہ خود، دن، دوپہر، شام یا رات کسی وقت، کسی کھیت یا کسی بیٹھک یا کسی کھولے (بغیر چھت کا کچا پرانا کمرہ) میں مل لیا کرتی تھی۔ یہ سب معمول کے مطابق تھا۔ یہ سب معلوم ہونے کے بعد بھی اس سے کسی نے باز پرس کی، نہ اس بات پر اسے ملامت کی۔ تاہم ایک پھٹکار اس کے خاندان پر نجانے کن زمانوں سے پڑ رہی تھی۔ اس پھٹکار میں اس کے، اس کی ماں کے، اس کے باپ کے، اس کے شوہر کے، اس کے

بچوں گناہ گار ہونے کا احساس اسی طرح شامل تھا، جس طرح اس کی جلد میں سیاہ رنگ شامل تھا۔ کبھی، رات کے کسی خاموش پہر میں جب اس کی آنکھ اچانک کھلتی تھی، اور دن میں ہونے والا کوئی واقعہ اسے یاد آتا تھا تو ایک مدھم سی لہر اس کے وجود پر چھا جاتی تھی۔ جلد کی سیاہی، ایک گناہ نظر آنے لگتی تھی۔ وہ گناہ کو ایک کلوانھ کی صورت سمجھتی تھی، اور اس بات سے ایک طویل سمجھوتہ تھا، جو شاید کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ اب مولوی صاحب فرما رہے تھے کہ ہم سب گناہ گار ہیں تو اسے ذرا سی حیرت اس بات پر ہوئی تھی مولوی صاحب خود کو کیوں گناہ گاروں میں شامل کر رہے ہیں۔ کیا اس لیے کہ ان کا رنگ ذرا سا سیاہی مائل ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر مولوی صاحب سے وہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر پا رہی تھی۔

اسی دوران میں مولوی صاحب کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ مولوی صاحب نے 'جی میں شام پانچ بجے پہنچ جاؤں گا' کہہ کر فون بند کر دیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھ کہ ہم سب گناہ گار ہیں۔ مگر خدائے وحدہ لاشریک نے ہمیں ایک ایسے بٹن سے نوازا ہے کہ ہم اپنے گناہوں کو ڈیلیٹ کر سکتے ہیں۔ یہ بٹن ہے، توبہ استغفار، صدقہ، خیرات اور نماز روزہ، حج.....

اچانک مولوی صاحب کو کسی خیال نے روک لیا۔ مولوی صاحب نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ایک گٹھڑی سی نظر آ رہی تھی۔ آدھا سر نیلے رنگ کے میلے سے دوپٹے سے ڈھکا تھا، اور مولوی صاحب کی قدموں کی سمت جھکا ہوا تھا۔ مٹیالے الجھے بال اسے وحشت ناک بنا رہے تھے۔ چہرہ سیاہ تھا، اور مرجھایا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کو واقعی اس پر ترس آیا۔ اچھا اب تم جاؤ، میں دعا کیا کروں گا۔ تم ہر وقت اللہ کو یاد کرتی رہا کرو۔ وہ سب کو بخشنے والا ہے۔

مدت بعد اس نے اٹھتے ہوئے، اپنے گھٹنوں پر ہاتھ نہیں رکھے۔ ایک نامعلوم سی طاقت کا اثر اس نے محسوس کیا۔

O

''مولبی صاحب، میرے بچڑوں کے لیے دعا کرو''۔

''اب دعا کی کیا ضرورت ہے''؟ مولوی صاحب حیران تھے کہ اس کے چاروں بچے خون

تھوکتے تھوکتے، ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، اب وہ کس لیے دعا کروانے آئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا گلہ رندھ گیا تھا۔ آپ دعا کریں انھیں وہاں ٹانگیں جلد سے جلد نصیب ہو جائیں، ان کا تاپ اتر جائے اور وہ سکھی رہیں۔ اسے کوئی اور بات نہیں سوجھی۔

یہ... یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ مولوی صاحب نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک مولوی صاحب کو ایک خیال آیا۔ کیا انھوں نے کلمہ پڑھا تھا؟ میرا مطلب ہے، وہ... ہمارے نبی پاک ﷺ کا کلمہ پڑھ لیتے تھے؟ مولوی صاحب کو یاد نہیں کہ کبھی کسی مصلی نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی ہو۔ انھیں کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اگر کوئی مصلی مسجد میں داخل ہو گیا تو وہ اسے نماز کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ گاؤں کے اکثر لوگ ان لوگوں کے مذہب کے سلسلے میں شک میں مبتلا رہتے تھے۔ ایک بات کا البتہ انھیں یقین تھا کہ وہ نہ تو عیسائی ہیں، نہ ہندو، نہ سکھ۔ یہ ایک ایسی بات تھی، جس نے مصلیوں کے پانچ سات خاندانوں کو گاؤں کے لیے قابل قبول بنایا ہوا تھا، کیوں کہ ان تین مذہبوں سے ہٹ کر وہ کسی مذہب کا تصور نہیں کرتے تھے۔ ایک اور وجہ سے بھی وہ گاؤں والوں کے لیے قابل قبول تھے۔ کہیں سے غلاظت کا ڈھیر ہٹانا ہو، شادی بیاہ، موت فوت سے بچ جانے والا جھوٹا کھانا ٹھکانے لگانا ہو، یا مکانوں کی تعمیر کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت ہو تو مصلیوں کے خاندان کے سب افراد کام کرتے تھے۔ کچھ عرصے سے ان کی لڑکیوں اور عورتوں نے گاؤں کے گھروں میں جھاڑو صفائی کا کام بھی سنبھال لیا تھا، کہ اکثر عورتیں استانیاں لگ گئی تھیں۔

''مولبی صاحب، وہ بول نہیں سکتے تھے، سن نہیں سکتے تھے۔ گنگے ڈورے تھے''۔ وہ بے حد ڈر گئی تھی۔

''تمھیں کلمہ آتا ہے''؟ مولوی صاحب نے راست سوال پوچھا۔

جی۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس نے فر فر پڑھ دیا۔

یہ سنتے ہی مولوی صاحب عجیب دبدھے میں پڑ گئے۔ انھیں پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں اس سے کوئی توہین تو نہیں ہو گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ ایک پکھی واس مصلن کی زبان سے پاک کلمہ سنا... لیکن انھیں سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کریں؟

''اچھا یہ بتاؤ، کبھی ان کی طرف سے کلمہ پڑھا''؟ مولوی صاحب نے دریافت کیا۔

''ان پر کلمہ پڑھ کر پھونکتی تھی، مگر ان کی طرف سے.... مجھے تو پتا ہی نہیں تھا''۔ وہ منمنائی۔

''کیا ان کے کان میں اذان دلائی تھی''؟ مولوی صاحب نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے موئے سلی، اپنے خاوند سے کہا بھی کہ مولبی صاحب کو بلالاؤ، بچے کے کان میں اذان دلانی ہے، مگر وہ کہتا تھا ہمارے گھر کبھی کوئی داڑھی والا آیا ہے؟ کوئی اور بھی ہمارے گھر نہیں آتا، مولبی صاحب۔ ہمارا گھر ہے ہی کہاں۔ اب ایک جھگی ڈالی ہے، نسلوں سے ہم پکھیوں' کلیوں میں رہے ہیں۔ میں نے بھی کلمہ چھ مہینوں میں یاد کیا، ایک اللہ کی نیک بندی نے یاد کرایا، مجھے اس نے کئی تھپڑ بھی مارے، مگر میں نے سہے، اور کلمہ یاد کیا۔ اس لیے یاد کیا کہ شاید اللہ ان کی مصیبت کاٹ دے۔ اللہ کے کلام میں برکت ہے''۔ اس نے سچ بول دیا۔

''جب وہ مرے ہیں، ان کی طرف سے کسی نے کلمہ پڑھا''؟

''میں ان کے لیے بار بار کلمہ پڑھتی تھی، پر مجھ مورکھ کو کیا پتا کہ ان کی طرف سے پڑھنا ہے؟ ہمیں کوئی نہیں بتاتا۔ ہم میں سے کوئی مسجد، کوئی سکول نہیں جاتا، کوئی ہمیں بتانے نہیں آتا، مولبی صاحب۔ ہم یہاں دو نسلوں سے رہ رہے ہیں، آپ کو پتا بھی نہیں ہوگا ہمارا گھر کہاں ہیں۔'' وہ رو رہی تھی۔

مولوی صاحب کا رنگ اچانک بدل گیا۔ وہ کچھ کہنے لگے، رک گئے۔ پھر غصے میں آ گئے: ''تم ہندو، کراڑ ہو۔ تم مسلمان ہو ہی نہیں۔ مسلمان وہ ہوتا ہے جس کے پیدا ہونے کے بعد، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اور جب مرتا ہے تو اس کی زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا ہے''۔

''بعد میں بندہ مسلمان نہیں ہو سکتا''؟ اس کی آواز میں رقت تھی۔

''ہو سکتا ہے، ضرور ہو سکتا ہے۔ اگر اسے خدا اس قابل سمجھے، اور اسے توفیق دے تو''۔ مولوی صاحب کا لہجہ اب بھی درشت تھا۔

''لیکن مولوی صاحب، میں چاہتی ہوں، آگے میرے بچھڑے اپنے پاؤں پر چلیں، ان کا تاپ اتر جائے، انھیں کھگھ نہ ہو، بلغم میں خون نہ ہو، اور بولیں چالیں''۔

"کیا ان کا جنازہ پڑھا گیا تھا؟ کس نے پڑھایا تھا؟"

"جی، بہت کوشش کی، کوئی تیار نہیں ہوا۔ پھر ہماری برادری کا ایک بندہ آیا تھا، جو دوسرے گاؤں میں رہتا ہے، اور اس نے پکا گھر بنوایا ہوا ہے۔ اس نے چاروں کے جنازے پڑھائے تھے"۔

"سارے کافر سیدھے جہنم میں جائیں گے"۔ مولوی صاحب کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"کہیں بھی جائیں، اپنے پاؤں پر چل کر جائیں۔ میں تو ان کی آواز سن نہیں سکی، کوئی اور انھیں بولتا دیکھے۔ مولبی صاحب، وہ ایک دن بھی نہیں چلے تھے ... میں ان کا گوہ موت صاف کرتی تھی۔ ماں مرے کبھی کبھی دو دون گندے پڑے رہتے تھے۔ سب چاہتے تھے، مرجائیں۔ مولبی صاحب، پر جب مرے ہیں تو میں نے خود انھیں نہلایا تھا۔ میں نے سنا ہے خدا سب کچھ کرسکتا ہے۔ آپ مجھے کوئی تعویذ دے دیں، میں اسے پانی میں گھول کر روزانہ ان کی قبروں پر ڈال آؤں گی"۔ ممتا ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"تعویذ مسلمانوں کے لیے دیے جاتے ہیں"۔ مولوی صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک ہے مولبی صاحب۔ بس اتنا بتادیں، میرے بچڑے مرنے کے بعد کیسے مسلمان ہوسکتے ہیں"؟ ماں ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھی۔

مولوی صاحب ایک عالمِ حیرت میں تھے!

■•◆•◆•◆•■

کہاں ہوں؟

انسان پر ضرور ایک ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ اس کا کہیں کچھ بھی ذکر نہ تھا۔

(سورۃ الانسان، پہلی آیت)

میں کہاں ہوں، یہ بتانا مشکل ہے۔ خدا جانے یہ کیا ہے؟ جگہ ہے، مکاں ہے، خلا ہے، یا ان سب کے سوا کچھ ہے، یا انھی میں سے کچھ ہے؟ بڑی گڑبڑ ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے اس سے پہلے کچھ دیکھ نہیں رکھا، سننے کی قسم نہیں کھا سکتا۔ سننے میں کئی چیزیں آئیں۔ سنی ہوئی ساری چیزیں یاد تھوڑی رہتی ہیں۔ دوبارہ سنیں تو کچھ کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ بار بار سنیں تو سدا یاد رہتا ہے۔ پر دوبارہ کون سنائے؟ کوئی ہو تو؟ شاید ہو۔ میں تو اپنے مشاہدے کی بات کررہا ہوں۔ خیر، آپ یوں سمجھیے، میں ایک ایسی دنیا میں ہوں، جو زبان سے باہر کی دنیا ہے۔ جی، آپ اسے خاموشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ خاموشی بھی زبان ہے، بلکہ غضب کی زبان ہے۔ جو آدمی زبان سے نکل کر خاموشی میں چلا جاتا ہے، اس سے ڈرنا چاہیے۔ اسی طرح، جس طرح آدمی سے زیادہ طاقت ور، اس کا بھوت ہوتا ہے۔

میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں بتاسکوں کہ کہاں ہوں، مگر بتانا بھی ضروری ہے، اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ضروری میں خود ہوں۔ میں کتنا ضروری ہوں، اس کو صرف اسی سے سمجھا جاسکتا ہے، جو میں کہہ رہا ہوں، یا کہہ سکتا ہوں۔ دیکھا، ابھی ایک پہیلی ختم نہیں ہوئی اور دوسری آپ کے سامنے رکھ دی۔ اس سے آپ میری حالت کے معما جیسے ہونے کا اندازہ لگالیجیے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اندازے سے کہا ہے کہ میں زبان سے باہر کی دنیا میں ہوں۔ میں نے زبان کی دنیا کو پوری طرح دیکھا

ہی نہیں۔ میں نے وہ کنارے نہیں دیکھے، جہاں زبان ختم ہوتی ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ زبان کا کوئی کنارہ ہوتا بھی ہے کہ نہیں۔ آدمی کسی جگہ چلے، ٹھوکر کھائے، تھک کر گرے، پھر اٹھے اور چلتا رہے، تب اسے کنارے کا خیال آئے۔ اور پھر کنارے کا خیال آنا ایک بات ہے، اور کنارے پر پہنچنا دوسری بات ہے۔ لیکن، ایک بات ہے، جو کنارے کا خیال کرسکتا ہے، وہ کنارے پر پہنچ بھی سکتا ہے۔ لیکن کنارے کا خیال یوں ہی بیٹھے بٹھائے تھوڑی آتا ہے۔ ویسے آدمی اگر زبان کے کنارے پر پہنچ جائے تو اس سے آگے کہاں جائے گا؟ زبان کے آخری کناروں کو سوچنا کتنا مشکل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آدمی ایک تنے ہوئے رسے پر چلتے ہوئے یہ سوچنے لگے، وہ رسا کہاں ختم ہوتا ہے؟ اس کا انجام معلوم۔ یا اس طرح ہے کہ آدمی سوچے کہ مرنے کے بعد وہ یہ سوچے گا کہ مرنے کا تجربہ کیسا تھا۔

آپ میری بات پر یقین مت کریں کہ میں زبان سے باہر کی دنیا میں ہوں۔ ذرا سوچیے، جس دنیا کے بارے میں زبان ہی بتائے کہ وہ اس کے باہر موجود ہے، وہ واقعی باہر موجود ہوسکتی ہے! یہ تو ایسے ہی ہے کہ آپ کسی کی موت کا یقین اس وقت کریں، جب وہ خود کہے کہ میں مر چکا ہوں۔ آپ نے کبھی مرے ہوئے کو اپنی موت پر بات کرتے ہوئے سنا ہے؟ جس دن لوگوں نے سن لیا، اس دن وہ خوشی خوشی مریں گے، یا موت سے پہلے مر جائیں گے۔ ویسے مرنے کے بعد آدمی کون سی زبان بولتا ہے؟ کیا اسے وہاں جا کر نئی زبان سیکھنی پڑے گی، یا اسی سے کام چل جائے گا؟ نئی زبان ماں سکھائے گی یا استانی؟ معلوم نہیں مرنے کے بعد مائیں کہاں جائیں گی؟ ماؤں کے بغیر وہ دنیا کیسی ہوگی؟ جسے عورت کے بجائے ماں چاہیے ہوگی، وہ کیا کرے گا؟ کوئی کہتا ہے، مرنے کے بعد آدمی عربی بولے گا، لیکن عربی تو صرف پڑھنے کے لیے ہے۔

آپ میری مشکل کچھ نہ کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں وہاں ہوں، جہاں زبان نہیں ہے۔ زبان کے لیے کم از کم 'دو' آدمی ضروری ہیں۔

زبان سے باہر اگر کوئی دنیا نہیں ہے تو اس سے پہلے تو کوئی دنیا ہوسکتی ہے؟ شاید یہ وہی دنیا ہے۔ معلوم نہیں، اسے دنیا کہنا بھی چاہیے کہ نہیں۔ دنیا نہ کہیں تو کیا کہیں؟ یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں، اور اکیلا ہوں یا شاید کوئی اور بھی ہے۔ یہاں کیا کیا کچھ ہے، اس

کے بارے میں علم تو تب ہو، جب سب کچھ نظر آئے، اور سمجھ آئے۔ بس گمان ہے کہ یہاں نظر آتا ہے۔ مجھے اشارے میں کہا گیا ہے کہ میں نے جلد ہی ایک سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ہوسکتا ہے، کچھ اور کہا گیا ہو، مگر میں نے اشارے کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اشارے کے چار پانچ مطلب ہوسکتے تھے۔ چار پانچ مطلب، اس وقت کام دیتے ہیں، جب صرف سوچنا ہو، لیکن جب کہیں سے نکلنا ہو، اور جلدی بھی ہو تو ایک مطلب سمجھ لینا ضروری ہے، خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ غلط مطلب بھی کام کا ہوتا ہے، جب وہ آدمی نے خود سمجھا ہو۔ جب مجھے سفر کا اشارہ ہوا ہے تو میں اس پر ہنس پڑا ہوں۔ مگر میری ہنسی کو ہنسی میں ڈال دیا گیا ہے۔ خیر! یہاں کچھ بھی بعید نہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے، اشارے سے پہلے ایک واقعہ ہوا۔ میں نے کچھ آوازیں سنیں۔ ہوسکتا ہے، وہ کسی زبان میں کی جانے والی باتیں ہوں، مگر مجھے کیا معلوم، میں تو زبان کی دنیا سے واقف ہی نہیں۔ مجھے بس یہ لگا کہ ان آوازوں کا کچھ تعلق مجھ سے ہے۔ ہوسکتا ہے، یہ میرا وہم ہو، یا ہوسکتا ہے، میں نے چاہا ہو کہ ان کا تعلق مجھ سے ہو۔ کب سے میں نے چاہنا شروع کیا کہ جو کچھ مجھ تک پہنچے، آواز، تصویر، اطلاع، اس سب کا تعلق مجھ سے ہو، مجھے یاد نہیں آرہا۔ مجھے لگا کہ جیسے ایک بھاری بھرکم، مگر چھدار آواز سے کوئی اختلاف کررہا ہو۔ جانے کیوں میں نے اپنی سبکی محسوس کی۔ میری سبکی کسی نے محسوس نہیں کی۔ عجیب سنگدلی ہے، یہ میں نے محسوس کیا۔ مجھے وہاں سے روانہ ہونے کا اشارہ ہوا۔ لڑائی کہیں، کسی کی ہوئی، نکل جانے کی سزا مجھے ملی۔ اس دھاندلی کو کون سمجھے؟

چوں کہ میں نے سفر کرنا ہے، اس لیے میرے پاس کچھ شناختی دستاویزات ہونی چاہئیں۔ یہ بھی میں نے اشارے سے سمجھا ہے۔ میں پھر ہنسا ہوں، پھر میری ہنسی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، خیر! یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک شخص جو مجھ سے پہلے آیا تھا، وہ ایک ہالے کی طرح مجھے گھیرے رہے گا۔ وہ میری تنہائی کو مکمل نہیں ہونے دیتے۔ کبھی اشاروں سے مداخلت کرتے ہیں، کبھی حکم سے۔ میری مشکل کو کیوں نہیں سمجھتے کہ میں موجود ہوں، کیا یہ کافی نہیں؟ میرا سفر کرنا کیوں ضروری ہے؟ ہر سفر کو ختم ہونا ہوتا ہے، اور ہر سفر کے ختم ہونے کا دکھ، اور سفر کا حساب الگ۔ دکھ کو تو جانے دیجیے، حساب بڑی تیز سی چیز ہے۔ سفر کے خاتمے پر اس کا بھی حساب دینا پڑتا ہے، جو جیب میں نہیں ڈالا گیا تھا۔ اور پھر مجھے ایک ہالے کی ضرورت کیوں ہے؟ میں جہاں ہوں، وہ "ہے" سے کچھ کچھ ملتا ہے۔ اس

کا کوئی مماثل نہیں۔ وہ مکمل "ہے"۔"ہے" کے اندر کیا ہے؟ یہ صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں، میں نے "ہے" کے اندر جا کر اس کے سب کونے کھدروں کو دیکھا ہے۔ اس کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا۔ وہ مجھے "ہے" سے نکال کر "ہونے" میں لے جانا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں جیسے ریت پر نقش بنتے ہیں، ویسے میرے "ہونے" سے بنیں۔ مجھے ریت بھی تلاش کرنی ہے۔ نہیں، "ہونے" کے اندر سے ریت پیدا کرنی ہے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟ سفر بھی کیا جائے اور چلنے کے لیے ریت بھی خود پیدا کی جائے۔ کیا زبردستی ہے؟ آگے سے خاموشی ہے۔ گویا غضب ہے۔ اب میں ہنسا نہیں، استفسار کیا، مگر میرے استفسار کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میں نے مزید استفسارات کیے ہیں۔ اگر میں اس کا انتخاب کروں گا تو کیا میں اپنے انتخاب کے سارے حقوق اسے نہیں دے دوں گا؟ وہ ہوگا تو اس کا بھی کوئی وہ ہوگا، اور آگے اس کا بھی ایک 'وہ' ہوگا؟ میں زنجیر میں بندھ جاؤں گا۔ جس آدمی کے دماغ میں صدیوں تک کی زنجیریں ہوں، وہ کبھی سوچ سکے گا؟ وہ سفر کرے گا یا صرف روتا رہے گا، جنگ کرتا رہے گا، راتوں کو جاگے گا اور دن کو تھکا ہوا ہوگا۔ میری باتوں کے جواب میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس خاموشی نے غضب ڈھایا ہے، اور ہاں مجھے پیغام دیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس پیغام کو سفر کے دوران میں پڑھنا ہے۔ چلیں کچھ نہ کچھ رخت سفر ملا۔

میرے ساتھ کوئی نہیں میرے جیسا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ میں نے ذرا سا خود کو یاد کر لیا ہے، سمجھنے کا آغاز، سفر کے دوران میں کروں گا۔ یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ میرے ساتھ 'وہ' بھی ہے۔ وہ بھی عجب ہے، اور اس کا میرے ساتھ ہونا اس سے بھی عجب ہے! مجھے کچھ سمجھ آئے تو بتاؤں کہ وہ کیسے میرے ساتھ ہے۔ میں نے اس کی صورت دیکھی ہے نہ شکل، لہٰذا مجھے نہیں معلوم کہ وہ ایک ہے یا زیادہ۔ اتنے ہیولوں میں کوئی کیسے کسی پر ہاتھ رکھے کہ یہ مجھ سے پہلے ہے۔ کچھ دیر تو میں ہنستا ہی رہا، پھر رویا۔ اب آپ کچھ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کہاں ہوں۔ خیر، میں نے یوں ہی ہاتھ چلایا، ایک ہیولے سے میری ہتھیلی پر ایک لکیر سی بن گئی۔ ہتھیلی کی یہ لکیر موت کے بعد بھی نہیں مٹتی!

ابھی میں نے اس لکیر کو محسوس کرنا شروع ہی کیا تھا کہ مجھے کہا گیا، مجھے مزید شناختی دستاویزات بھی لینی پڑیں گی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کہا گیا۔ اس کے لیے مجھے چھلانگ لگانی

ہوگی، ایک اندھی چھلانگ۔ میں اس مرتبہ رویا۔ کوئی پھولے ہوئے غبارے سے کہے کہ وہ چھلانگ لگائے تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ کیا مجھے دھکا نہیں دیا جا سکتا؟ جواب ملا، دیا جا سکتا ہے۔ میں نے رونا بند کیا، مگر یہ سنتے ہی ہنسنے لگا کہ میں خود ہی خود کو دھکا دوں گا۔ چلیں، اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، مگر کس طرف؟ اپنے لیے دھکے کا انتخاب تو وہ کرے، جس نے کافی جگہیں دیکھ رکھی ہوں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اصل چال کیا ہے۔ میں اپنے انتخاب اور اپنی چوٹوں کی ذمہ داری بھی قبول کروں۔

اس سے پہلے کہ میں چھلانگ لگاتا، میں نے محسوس کیا کہ کتنے ہی گٹھڑ مجھ پر لد گئے ہیں۔ شاید اس لیے کہ آسانی سے گر سکوں۔ لیکن ان کے بوجھ سے اب تک میں نے جو سنا، سوچا اور دیکھا ہے، سب بھول بھال جائے گا۔ مجھے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مجھے اس میثاق کو یاد رکھنا ہے۔ میری نئی مشکل یہ ہے کہ میں اس بوجھ کے ساتھ کیسے اپنی یادداشت کو بحال رکھوں، اور پھر آگے ریت پیدا کرنے، اور اس پر نشان بنانے کی مشقت میں کچھ اور یاد رہ پائے گا؟ مجھے اس کا جواب کون دے گا؟

■•◆•◆•◆•■

حکایاتِ جدید و مابعد جدید

بشن سنگھ مرا نہیں تھا!

اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو حیرت نہیں ہوئی تھی کہ منٹو کے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا بشن سنگھ مرا نہیں تھا، بے ہوش ہوا تھا۔ ان دیکھنے والوں کے ذہن میں پہلا سوال ہی یہ پیدا ہوا کہ جب بشن سنگھ گرا ہے تو کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس کی نبض ہی دیکھ لے۔ ہو سکتا ہے، چل رہی ہو۔ کیا سب اس کی موت چاہتے تھے؟ ایک پاگل سے اس قدر ڈرے ہوئے تھے؟ یا اُس کے اِس سوال سے ڈرے ہوئے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ دیکھنے والوں کو یہ سوال پریشان کیے جا رہا تھا کہ سب نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ بشن سنگھ جب زمین کے اس ٹکڑے پر اوندھے منھ گرا ہے، جس کا کوئی نام نہیں تھا، تو وہ مر گیا تھا۔ کیا اوندھے منھ پڑا ہوا آدمی لازماً مرا ہوا ہوتا ہے؟ یہ جو ایک نئی جگہ وجود میں آئی تھی، جس کا کوئی نام نہیں تھا، وہاں کوئی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا؟ زندہ رہنے کے لیے جگہ ہی کتنی چاہیے؟ بشن سنگھ کو زندہ دیکھنے والوں نے ایک دوسرے سے یہ بھی پوچھا کہ کیا زندہ رہنے والوں کو یہ فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ مٹی کے کس ٹکڑے پر رہنا پسند کریں گے؟ کیا زندہ رہنے کا حق صرف انھی کو ہے جو خاردار تاروں کے اِس طرف یا اُس طرف رہتے ہیں؟ زمین پر ان دو طرفوں کے وجود میں آنے کے بعد وہ سب لوگ کیا کریں جن کے لیے زمین سب طرفوں سے بے نیاز ہوتی ہے، اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب آدمی کا ہوتا ہے، مٹی کے ٹکڑے کا نہیں؟

دیکھنے والوں نے ایک دوسرے سے اس بات پر بھی تبادلہ خیال کیا کہ بشن سنگھ کی چیخ سن کر دوڑنے والے افسر، چوں کہ تبادلے کے کام سے تھکے ہوئے تھے، کیا اس لیے انھیں بشن سنگھ کی نبض دیکھنے کا خیال نہیں آیا؟ تھکے ہوئے افسر موت کے سوا کچھ نہیں سوچتے؟ ان تھکے ہوئے افسروں نے یہ غور کیوں نہیں کیا تھا کہ بشن سنگھ اوندھے منھ ہی کیوں گرا تھا؟ اوندھے منھ تو وہی گرتا ہے جسے دھکا دیا گیا ہو؟ اگر بشن سنگھ کو مرا ہوا سمجھنے والے غور کرنے کی تھوڑی سی زحمت کر لیتے تو اس شخص کی تلاش ضرور کرتے، جس نے بشن سنگھ کو خاردار تاروں پر دھکا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے، دھکا کئی دن پہلے، کئی ہفتے پہلے، یا پندرہ سال پہلے دیا گیا ہو، مگر لحیم شحیم بشن سنگھ گرا، اب ہو۔ ان دنوں دھکے بھی تو بہت لگ رہے تھے۔ کچھ دھکا دینے والے، پل بھر میں روپوش ہو جاتے تھے، کچھ ڈھٹائی سے وہیں رہتے تھے، لیکن پروا کسی کو نہیں تھی کہ کوئی کہاں، کب، کیسے گرا، جیسے کالی سیاہ آندھی کمزور جھاڑیوں کو جڑوں سمیت اکھاڑ کر کہیں سے کہیں لا پھینکتی ہے۔ بشن سنگھ کو زندہ دیکھنے والوں کا یہ خیال بھی تھا کہ اسے پندرہ سال پہلے ہی ہواؤں کی تبدیلی کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے اس نے درخت کی طرح جم کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، اور اس فیصلے پر اس وقت بھی قائم رہا، جب غضب ناک آندھی نے اس کے کئی ساتھیوں کو خاردار تاروں کی دوسری طرف پٹخ دیا تھا۔ اس نے آندھی کے مخالف رخ چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے زندہ دیکھنے والوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اتنے بڑے فیصلے کے لیے پاگل پن ہی چاہیے تھا!

بشن سنگھ کو زندہ دیکھنے والوں کی متفقہ رائے تھی کہ اگر اس شخص کو تلاش کر لیا جاتا، اور اس کے ٹرائل کی ہمت کر لی جاتی، جس نے بشن سنگھ کو دھکا دیا تھا تو خاردار تاروں کے دونوں طرف تو پیں نہ گرجا کرتیں۔ ایک بشن سنگھ کو مرا ہوا سمجھ کر، اس سے لاتعلق ہونے کی سزا کروڑوں لوگوں کو اتنی کڑی نہ ملتی۔ بشن سنگھ کو زندہ دیکھنے والوں نے اس بات پر کافی غور کیا کہ سرحد پر تبادلے کے افسروں نے بشن سنگھ کی چیخ کو مدد اور پکار کیوں نہ سمجھا، آخری ہچکی ہی کیوں سمجھا؟ کیا وہ افسر اس شخص کے ساتھ ملے ہوئے تھے، جس نے بشن سنگھ کو دھکا دیا تھا؟ یا تبادلے کا کام کرنے والوں میں مدد کی پکار اور موت کی چیخ میں فرق کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی؟ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ آوازوں میں فرق نہ کر سکنے کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے ہیں؟

دیکھنے والے، ایک طرف بشن سنگھ کو دیکھتے تھے، اور دوسری طرف آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ وہ پہلا سوال یہ کرے گا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ اس نے خاموشی سے سب کی طرف دیکھا۔ سب سوچنے لگے کہ وہ 'اوپڑ دی گڑ گڑ اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین' کہے گا، مگر وہ چپ چاپ سب کو دیکھتا رہا۔ سب منتظر تھے کہ بشن سنگھ کیا کہتا ہے۔ بشن سنگھ نے اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا، جو پندرہ سال تک کھڑے ہونے کی وجہ سے سوج گئی تھیں، اور کئی جگہوں سے پھٹ گئی تھیں، اور ان میں گہرے زخم تھے۔ اس نے پہلی مرتبہ ان میں شدید درد محسوس کیا۔ اپنے سینے کو دیکھا جس پر خاردار تاروں کے زخم تھے، اور خون اب تک تازہ تھا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ پہلی بار اسے ڈاڑھی کے بال کرخت محسوس ہوئے۔

دیکھنے والوں سے رہا نہیں گیا۔ سب بہ یک زبان بول اٹھے۔ بشن سنگھ کچھ کہو گے نہیں؟

بشن سنگھ نے سب کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی پہچان کا کوئی چہرہ نہیں تھا۔ دیکھنے والے سمجھ گئے کہ وہ خود کو اجنبیوں میں محسوس کر رہا ہے۔ ایک نوجوان بولا۔ تو ہم سب کو نہیں جانتا، ہم اپنا تعارف کروائے دیتے ہیں۔ بشن سنگھ، ہمارا جنم تمھارے 'اوپڑ دی گڑ گڑ اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین' سے ہوا ہے، جس میں تو کبھی 'لالٹین' ہٹا کر 'پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ'، اور آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان' کا اضافہ کر دیا کرتا تھا۔ تو زندہ ہے، اور دیکھ ہم تیری اوپڑ دی گڑ گڑ کی اولاد ہیں، جو کسی کو سمجھ نہیں آئی۔ ہم بھی کسی کو سمجھ نہیں آئے، پر تو ہمیں سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔ ہم تیری اس چیخ کا جواب بھی ہیں جو اس روز سورج نکلنے سے پہلے تیرے حلق سے نکلی تھی، اور جس سے فلک کا سینہ شق ہو گیا تھا، کیوں کہ تب زمین پر موجود لوگوں کے سینے پتھر ہو چکے تھے۔ تیری چیخ آسمانوں میں آوارہ پھرتی تھی، اور کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھی۔ تو نے اپنے بچاؤ کے لیے پوری قوت سے وہ چیخ ماری تھی، اس چیخ کو سن کر، ساٹھ سالوں سے دوڑتے ہانپتے یہاں تک کچھ لوگ آئے ہیں، اور انھوں نے اسے اپنے سینوں میں اسے جگہ دی ہے، ہم انھی کے نقش قدم پر چلتے چلتے یہاں پہنچے ہیں؛ بالآخر تیری چیخ کی جلاوطنی ختم ہوئی ہے۔ تیسرا نوجوان بولا۔ تو نومینز لینڈ پر ساٹھ سالوں سے پڑا تھا۔ ہم تمھیں وہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ بشن سنگھ نے سب کی طرف

مزید حیرت سے دیکھا۔

پہلا نوجوان بولا۔ تو، اینکس کا مطلب تو جانتا ہے ناں، نومینز لینڈ وہ ہے، جس کا اینکس نہیں ہوا تھا، نہ اس وقت ہو سکتا تھا۔ اس وقت آپا دھاپی تھی۔ ذرا چین ملا تو جس کا اینکس نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لیے بھی بندوقیں نکلیں۔ بشن سنگھ، ہم تمھیں کیسے بتائیں یہاں ہم کیسے پہنچے۔ جب تو بے ہوش ہو کر گرا تھا، اس وقت اس جگہ پر جھگڑا نہیں تھا۔ اس کے بعد کوئی جگہ، ایک انچ ایسا نہیں، کوئی لفظ ایسا نہیں جس پر جھگڑا نہ ہوا ہو، جہاں خون نہ گرا ہو، جہاں خون گرنے کا ہر وقت امکان نہ ہو۔ تو جہاں موجود ہے، اس پر بھی دونوں طرف بہت جھگڑے ہوئے ہیں۔ اب جگہ کا مطلب بھی بدل گیا ہے، اب لفظ، کہانی سب جگہ ہیں، ان پر کس طرح کے جھگڑے ہیں، تو سنے تو تیرے سینے میں اس سے بڑا گھاؤ لگے، جو خاردار تاروں پر گرنے سے تجھے لگا تھا۔ اب طرح طرح کی خاردار تاریں یہاں وہاں ہیں، اور کچھ تو ایسی ہیں جو دکھائی بھی نہیں دیتی، اور گھائل روح کو کرتی ہیں۔ تو کبھی یہاں کے کسی شہر میں چل پھر کے دیکھ، ہر دیوار پر چکر کھاتی خاردار تاریں ہیں۔ زمانے ہوئے، ہم جنگلوں سے آبادیوں میں آئے تھے، اب سب آبادیاں خاردار تاروں کے جنگل بن گئی ہیں، اور آنکھوں سے لے کر سانسوں میں، اور اس سے بھی آگے دلوں میں تراز و ہوتی ہیں۔

بشن سنگھ کی حیرت کچھ کم ہوئی، مگر سخت کرب اس کے چہرے سے عیاں تھا، اور اس کی سفید گرد آلود ڈاڑھی بھیگ گئی تھی۔

دوسرا نوجوان بولا۔ بشن سنگھ، ہم سب حیران تھے کہ تمھیں مردہ سمجھنے والوں نے تیرے انتم سنسکار کا بھی نہیں سوچا۔

تیسرا نوجوان بولا۔ اچھا کیا نہیں سوچا، ایک جیتے جاگتے آدمی کو چتا میں ڈال دیتے، اور پھر جھگڑا اس بات پر ہوتا کہ لاش کس طرف کے گوردوارہ میں لے جائیں، معلوم نہیں کوئی گوردوارے میں جانے کی اجازت بھی دیتا کہ نہیں، کوئی کیرتن کے لیے بھی ملتا کہ نہیں، پھر اس پر بھی جھگڑا ہوتا کہ چتا کے لیے لکڑیاں خاردار و تاروں کے اس طرف کی ہوں، یا اس طرف کی، راکھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس کے دریا میں بہائیں یا کہیں اور۔ تم جانتے ہو، اس کے بعد جنگل، دریا، شہر سب کو ہماری طرح مذہب مل گیا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کا سن کر بشن سنگھ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، جیسے پوچھ رہا ہو، تم کس طرف کے ہو؟

پہلا نوجوان سمجھ گیا۔ بولا۔ بشن سنگھ ہم منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرف کے ہیں۔

بشن سنگھ ایک مرتبہ پھر حیران ہوا۔ وہ تو اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واقف تھا، یہ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں سے آ گیا۔ دوسرے نوجوان نے اس کی حیرانی دیکھتے ہوئے کہا، بشن سنگھ، تیرے ٹوبہ ٹیک سنگھ نے تو تجھے نکال دیا تھا، منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ نے تمھیں اپنے دل میں جگہ دی۔ بشن سنگھ نے دیدے پھاڑ کر دیکھا۔ تیسرا نوجوان اس کی مشکل سمجھ گیا۔ بولا۔ بشن سنگھ، تو جس جگہ گرا تھا، وہ کسی کی نہیں تھی، منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ اسی خاک کے ٹکڑے سے اگا تھا۔ تجھ سے زیادہ کس کو معلوم ہوگا کہ خاک کا وہ ٹکڑا، اسی دھرتی کا حصہ تھا، مگر خاردار تاروں کے بعد اس ٹکڑے کی حالت اس عفریت کی سی ہو گئی تھی، جس کے خون کا قطرہ زمین پر گرتا تھا تو اس سے نئے عفریت جنم لیتے تھے۔ خاک کے عفریت بننے کی کہانی پرانوں زمانوں کی کتابوں میں کہیں نہیں ملتی، صرف منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ملتی ہے، جہاں تجھے ٹھکانہ ملا ہے۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ اور تم دونوں نئے زمانے کی سب سے بڑی اسطورہ ہو۔ دوسرے نوجوان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے، بشن سنگھ کی پنڈلی کو چھوا، جس سے پیپ رس رہی تھی، جس طرح خون پیپ میں بدل کر تکلیف اور گھن پیدا کرتا ہے، ہماری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ہمیں اجنبی نہ سمجھ بشن سنگھ! تو حیران ہے، مگر ذرا سوچ اگر منٹو تجھے اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جگہ نہ دیتا تو کسی کو پتا ہی نہ چلتا کہ کوئی بشن سنگھ تھا، اور اس کا ایک ٹوبہ ٹیک سنگھ تھا جہاں اس کی زمینیں تھیں، اور جہاں اس کی بیٹی روپ کور اور اس کا دوست فضل دین رہتا تھا، اور جو اسے تبادلے سے کچھ دن پہلے ملنے آیا تھا۔ تجھے منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ نہ ملتا تو ہو سکتا ہے تو بھوت بن جاتا، اور تیری اوپڑ دی گڑ گڑ سے راکھشس جنم لیتے، ہم نہیں۔ منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ نے تجھے بچا لیا اور تجھے ابدی ٹھکانہ بھی مل گیا۔ اس نے آنکھیں جھپکیں۔ جیسے پوچھ رہا ہو، میں اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو چھوڑ کر کسی اور کے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کیسے رہ سکتا ہوں، جیسے کہہ رہا ہو، میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ پہلا نوجوان اس کا سوال سمجھ گیا۔ بولا۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، تیرا ابدی ٹھکانہ یہی ہے۔ لیکن یہ سن کر تیرا کلیجہ منھ کو آئے گا کہ تیرے اس ٹھکانے کو

بھی لوگوں نے نہیں بخشا۔ منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اینکس کی کوشش، اِدھر اور اُدھر کے پڑھے لکھے لوگوں نے کی، اور ایک اور طرح کے، تیرے تبادلے کا منصوبہ بنایا؛ اس منصوبے میں نومینز لینڈ ہے ہی نہیں۔ تیری طرح منٹو غریب کو بھی اسی سرحد پر لے گئے، اور اس کے تبادلے پر لمبی چوڑی بحثیں کیں، شکر ہے کچھ سمجھ دار لوگ بیچ میں آ گئے، اور انھوں نے منٹو کو اِدھر یا اُدھر گھسیٹنے کی مزاحمت کی، اور ان کی کوششوں کو تیری زبان میں در فٹے منھ کہا۔

بشن سنگھ نے ان تینوں کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو مجھ سے تو پہلی مصیبت نہیں جھیلی جاتی، اور تم نئی مصیبتوں کے بیان سے میرا سینہ چھلنی کیے دیتے ہو۔ دوسرا نوجوان بولا۔ دیکھو، بشن سنگھ، ہم سب اپنے اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جب ایک دفعہ نکل جاتے ہیں تو واپس نہیں جا سکتے، اور جس نئے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جا بستے ہیں، وہاں سے نکل نہیں سکتے، اور ہر کسی کو نیا ٹوبہ ٹیک سنگھ نہیں ملتا۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو صرف مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ بالآخر بھوت بن جاتے ہیں، اور انسانوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل جاتے ہیں۔ تمھیں تو نیا ٹوبہ ٹیک سنگھ مل گیا، تو امر ہو گیا، ہم جیسے کتنے ہی تیری اوپڑ دی گڑ گڑ سے جنمے، اور جنم لیتے رہیں گے، مگر انھیں نہ تو اپنا ٹوبہ ٹیک سنگھ ملے گا، نہ کسی منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

بشن سنگھ کی ڈاڑھی بھیگ گئی۔ پہلے نوجوان نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا، اور ان میں تیرتی نمی کا مفہوم سمجھا، اور بولا۔ میں سمجھ گیا بشن سنگھ، تو اس لیے دکھی ہے کہ تو امر تو ہو گیا، لیکن اپنی سوجی ٹانگوں اور دھکا لگتے سمے، سینے میں لگنے والے زخموں کے ساتھ۔ بشن سنگھ، ابدی زندگی خود ایک سزا ہے، لیکن سوجی ٹانگوں اور رستے زخموں کے ساتھ امر ہونا، سزائے عظیم ہے، اور یہ دونوں سزائیں ہم تیرے ساتھ چار پشتوں سے بھگت رہے ہیں!!

☆☆

بو آئی کہاں سے؟

اس بچے پر کسی نے اعتبار نہیں کیا، جو سکول سے آنے کے بعد بستہ پھینکتا ہے، اور رات گئے تک بستی کی گلیوں کی خاک چھانتا ہے۔ اس نے ایک شام اپنی ماں کو بتایا کہ اسے ہر گلی میں ایک عجیب

وغریب بو محسوس ہوئی ہے، اور اس نے گلیوں میں بلیوں اور کتوں کو تیز تیز بھاگتے اور سر پٹکتے دیکھا ہے۔ اس کی اس بات کو بھی کسی نے سنجیدہ نہیں لیا کہ اس نے ایک گلی میں ایک کتے کو باقاعدہ دیوار کی طرف منھ کر کے روتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس کے گرد کئی کتے سر جھکائے ماتمی حالت میں بیٹھے تھے۔ کتا، رو کیسے سکتا ہے؟ سب اس بچے پر ہنسنے لگے۔ جیسے میں۔ بچے نے بے ساختہ کہا۔ تو تُو کتا ہے؟ بڑے بھائی نے مذاق اڑایا۔ دو دن بعد بچے نے ایک نئی بات کہی۔ میں نے بستی کی آخری گلی میں بے شمار بلیوں کو دیواروں سے ناکیں رگڑتے ہوئے اور انھیں لہولہان ہوتے دیکھا ہے، اور میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنی ناک کسی دیوار سے رگڑوں۔ بو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ سب نے پھر مذاق اڑایا۔ کچھ دنوں بعد بستی کے دوسرے بچوں نے بھی اپنے اپنے گھر میں اس بو کا تذکرہ کیا۔ ہر بچے کے پاس کتوں کے رونے اور بلیوں کے ناکوں کو زخمی کرنے کی کہانی تھی۔

ایک دن مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلتے ہوئے اللہ بخش نے خان محمد سے کہا، کیا تمھیں کچھ محسوس ہوا؟ سب نے یہ سوال ایک دوسرے سے کیا۔ سب نے کہا کہ ہاں محسوس ہوا۔ گھر میں بیٹھی سب عورتوں نے بھی یہی سوال ایک دوسرے سے کیا۔ سب نے کہا، ہاں محسوس ہوا ہے۔ یہ بو آ کہاں سے رہی ہے؟ پوری بستی چھان ماری۔ سب کا خیال تھا کہ شاید کہیں مردہ جانور موجود ہے۔ بستی کے جانور گنے گئے۔ پورے تھے۔ گدھے گنے گئے۔ پورے تھے۔ آوارہ کتوں کی تعداد کسی کو معلوم نہیں تھی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ کہیں کوئی کتا مرا پڑا ہے، جس کی بو پوری بستی میں پھیل گئی ہے۔ لیکن ایک مرے کتے کی بو ساری بستی میں کیسے پھیل سکتی ہے؟ یہ سوال بستی کے لوگوں کو زیادہ پریشان کرتا تھا۔ بڑوں کو بھی نظر آنے لگا کہ کچھ کتے کہیں اکٹھے ہوتے ہیں، اور رونے جیسی آوازیں نکالتے ہیں۔ اس سے بستی والوں کا شک یقین میں بدل گیا کہ ضرور کوئی کتا ہی مرا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس بستی کی پچھلی نسل کی کتیوں نے جنگل کے بھیڑیوں کے حمل ٹھہرائے تھے، اس لیے نئی نسل کے کتوں نے رونے کا یہ ڈھنگ اپنے نئے آبا سے سیکھا ہے۔ آخر کتا کہاں مرا پڑا ہے؟ نتھنوں میں گھس کر آدمی کو بے بس کر دینے والی اس بو کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ بو ہر جگہ، ہر وقت تھی، اور ایک جیسی شدت کی تھی۔ جب دوسری بستی سے آنے والوں کو بھی وہی بو محسوس ہوئی تو انھوں نے وہاں آنا بند کر دیا۔ غضب اس وقت ہوا، جب اس

بستی کا کوئی شخص دوسری بستی میں جاتا تو اس بستی میں بھی بو پھیل جاتی۔ چند ہی دنوں بعد اس بستی کے سب لوگوں سے آس پاس کی سب بستیوں کے لوگوں نے تعلق ختم کر لیا۔ جن بیٹیوں کے ماں باپ دوسری بستی میں تھے، انھوں نے بیٹیوں کو بھلا دیا، اور جن ماں باپ کی بیٹیاں وہاں بیاہی تھیں، انھوں نے اس بستی میں آنا بند کر دیا۔ کئی ڈاکٹروں حکیموں کو بلایا گیا، سب نے آنے سے انکار کر دیا۔ سرکار نے بھی کوئی توجہ نہ کی۔ کچھ عرصہ بعد اس بستی کے ہر شخص نے دوسرے شخص سے بات چیت، میل ملاقات ختم کر دی۔ وہ جوں ہی بولنے لگتے، یا ایک دوسرے کے قریب آتے، بو کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ سب کے نتھنوں، منھ میں بو ہر وقت بھری رہتی۔

لوگوں سے میل ملاقات کے بعد کام کاج چھوٹ گیا۔ پھر کھانا پینا چھوٹ گیا۔ نیند تو کب کی غائب تھی۔ صرف بچے سو سکتے تھے۔ ماں باپ نے کام کاج چھوڑا تو بچے بھوک سے تڑپنے لگے۔ بو اس قدر تیز اور ناگوار تھی کہ مائیں بچوں کی بھوک کے سلسلے میں بے حس ہو گئیں۔ پھر ایک دن بستی کا ایک شخص مرا۔ سب اس قدر ڈرے ہوئے تھے، اور بو سے اس قدر بے زار تھے، اور ان کے بدن اس قدر لاچار تھے کہ نہ کسی نے اس کا جنازہ پڑھا، نہ اسے دفنایا۔ اس کے بیٹوں اور بھائیوں نے بھی نہیں۔ ایک دن بعد بستی کے لوگوں نے دیکھا کہ جہاں لاش پڑی تھی، وہاں گدھ آئے ہیں۔ وہ ڈرے بھی اور تھوڑے مطمئن بھی ہوئے۔ اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بھوکے بچے گلیوں میں پھر رہے تھے، انھوں نے آدمی کی لاش پر گدھوں کو دیکھا تو ان سے رہا نہیں گیا۔ انھوں نے وہیں گڑھا کھودا، اور اسی طرح لاش کو دفنا دیا، البتہ جنازہ پڑھنے پر بچوں میں تھوڑا اختلاف ہوا۔ کسی کو ٹھیک طرح معلوم ہی نہیں تھا کہ کیسے پڑھتے ہیں۔ چھٹی کے ایک بچے کو جنازے کی دعائیں آتی تھیں، اس نے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ دیں۔ بستی کے لوگوں نے محسوس کیا کہ جیسے بو کچھ کم ہو گئی ہے۔

اس کے بعد سب لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی موت کی خواہش کرنے لگے، اور کچھ نے ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش بھی کر ڈالی، لیکن وہ اس قدر نحیف ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کا گلا دبانے سے قاصر تھے۔ بستی میں زہر دستیاب نہیں تھا۔ کچھ کے پاس پستول ضرور تھا مگر اس کا گھوڑا دبانے کی ہمت نہیں تھی۔ لوگوں نے ہاتھوں میں چھریاں اٹھائیں اور گلیوں میں آئے، مگر چار قدم چلنے

اور چھری چلانے کی ہمت جمع نہ کر پائے۔ پھر ایک رات ایک بوڑھے کو ایک لمحے کی جھپکی آئی، اس نے خواب دیکھا کہ وہ خود کو دفنا رہا ہے، اور بو نہیں ہے۔ اس نے جاگتے ہی ایک عجب ہمت محسوس کی، اور اپنے نتھنوں میں بو کو غائب پایا۔ وہ چیختا ہوا مسجد میں آیا، اور خوشی کے عالم میں لاؤڈ سپیکر میں اپنا خواب سب کو سنایا۔

☆☆

ستر سال اور غار

وہ ستر سالوں سے غار میں تھا۔ یہ بات تھوڑے لوگوں کو معلوم تھی۔ ان تھوڑے لوگوں میں اسحاق بھی شامل تھے۔ اسحاق نے اس بات کو راز میں رکھا کہ انھیں کیسے معلوم ہوا تھا، لیکن اس بات کو راز میں نہیں رکھا کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ستر سالوں سے غار میں ہے۔ ایک بات کو راز رکھنے اور دوسری کو عام کرنے کی خاص وجہ تھی، اور اسے بھی اسحاق ہی جانتے تھے، مگر کبھی کبھی کسی خاص شخص کو بتا بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دن عصر کے بعد ان کے پاس چار لوگ آئے۔ اسحاق مصلے سے اٹھے اور لکڑی کے تخت پر آ بیٹھے۔ سائیں بڑی مشکل میں ہیں، دعا فرمائیے۔ جس گاؤں سے آئے ہیں، وہاں کے لوگ چھ ماہ سے ایک پل نہیں سوئے۔ روز ایک لاش کہیں سے آتی ہے، مسجد میں اعلان ہوتا ہے، کس کی لاش ہے، سب دوڑے دوڑے آتے ہیں، جو دیکھتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اسی کی لاش ہے۔ سارا گاؤں مل کر اسے دفناتا ہے، واپس آتا ہے، سب ایک دوسرے کا کھانا پکاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ستھر پر سارا گاؤں بیٹھتا ہے۔ سارا گاؤں، ایک دوسرے سے تعزیت کرتا ہے۔ ایک دوسرے کو 'امر ربی' کہتا ہے، اور فاتحہ پڑھتا رہتا ہے، ابھی سوئم نہیں ہو پاتا کہ پھر ایک لاش کا اعلان ہوتا ہے۔ چھ ماہ سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں، اور ڈر رہے ہیں کہ کہیں ہماری لاشیں گاؤں میں نہ آ چکی ہیں، اور ایسا نہ ہو کہ وہ سڑ جائیں۔ کچھ دن پہلے غلام محمد گاؤں سے ایک دن کے لیے گئے، واپس آئے تو ان کے گھر میں سڑاند پھیل چکی تھی، انھیں اکیلے ہی اپنی لاش دفنانی پڑی، اور کوئی پرسہ دینے بھی نہیں آیا۔ گاؤں میں لاش پہنچے کا کوئی وقت نہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ کوئی خاص جگہ بھی مقرر نہیں جہاں لاش ملتی ہو۔ اسحاق نے ان کی طرف غور سے دیکھا، حیرت ظاہر کی اور کہا۔ میں نہیں، ایک اور شخص تمھاری

مدد کر سکتا ہے، جس نے ستر سالوں سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی، پر سب جانتا ہے کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟

وہ چاروں بہ یک وقت حیران ہوئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ستر سالوں سے غار میں رہنا، یا ایک پل کے لیے باہر سر نکالے بغیر باہر کے بارے میں پل پل کی خبر رکھنا؟

سائیں، دونوں۔ چاروں بہ یک وقت بولے۔

تم اپنی مشکل کا حل چاہتے ہو، یا اسرار جاننا چاہتے ہو؟ اسحاق نے تسبیح کے دانوں سے وقفہ لیتے ہوئے کہا۔

سائیں دونوں۔ چاروں بہ یک وقت بولے۔

اگر تمھیں کوئی یہ کہے کہ فلاں درخت کی ایک شاخ کا پتا کھانے سے آدمی بندر بن جاتا ہے، اور دوسری شاخ کا پتا کھانے سے واپس آدمی بن جاتا ہے تو تم کس شاخ کا پتا حاصل کرنا پسند کرو گے؟

اسحاق نے تسبیح سے ایک اور وقفہ لیا۔

سائیں، میں دوسری شاخ کا پتا حاصل کروں گا۔ ایک بولا۔

سائیں، میں دونوں حاصل کرنے کی خواہش کروں گا۔ دوسرا بولا۔

تیسرا چپ رہا۔

سائیں، میں اس درخت کا علم حاصل کروں گا۔ چوتھا بولا۔

تمھاری مشکل کا حل اب دو آدمیوں کے پاس ہے، ایک وہ جو ابھی چپ ہوا، دوسرا جو ستر سالوں سے چپ ہے۔ اسحاق بولے۔

وہ کیسے؟ باقی تین بولے۔

تم تینوں نے ایک ایسی صورتِ حال سے اپنے لیے راستہ منتخب کرنا شروع کر دیا، جو 'ہے' نہیں، 'ہو سکتی' تھی، یا کبھی 'تھی'۔ جو چپ رہا، وہ جانتا ہے کہ راستہ وہی چنا جاتا ہے جو 'ہو'۔ اسحاق بولے۔

تینوں نے اس چوتھے کی طرف دیکھا جو چپ تھا۔ وہ اب بولا۔ وہ درخت تو میرے اندر

ہے۔ پر میں نے کبھی اس کے پتے نہیں کھائے۔

پر ہمارے اندر تو ایسا کوئی درخت نہیں۔ تینوں بہ یک وقت آواز ہو کر بولے۔

تو اس شخص کے درخت سے اپنی مرضی کا پتا لے لو۔ اس مرتبہ اسحاق مسکرائے۔

سائیں، اب ہم نئی مشکل میں ہیں، اس درخت کے پتے حاصل کریں یا اس مشکل کا حل تلاش کریں جو ہمارے گاؤں کو لاحق ہے؟ تینوں بہ یک وقت بولے، چوتھا چپ رہا۔

اس کا جواب بھی تمھیں ستر سالوں سے چپ شخص سے ملے گا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے ایک خوں خوار شیر کا راستہ روک رکھا ہے، جو سب انسانوں کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔

سائیں گستاخی نہ ہو تو عرض کریں۔ اگر اس نے شیر کا راستہ روک رکھا ہے تو کون ہے جو روز ہماری لاشیں ہمیں بھیجتا ہے؟ اب چاروں بہ یک وقت بولے۔

تمھیں کیسے یقین ہے کہ وہ تمھاری لاشیں ہیں؟ اسحاق نے الٹا ان سے سوال کیا۔

سائیں، ہم خود انھیں دیکھتے اور دفناتے ہیں۔ چاروں بولے۔

پھر تم کون ہو؟ اسحاق نے تعجب کیا۔

چاروں چپ ہو گئے۔

اگر وہ واقعی تمھاری لاشیں ہیں تو تم ایک ہی دفعہ خود کو کیوں نہیں دفناتے؟ کیا اپنی قبر پر تم مٹی نہیں ڈالتے؟ ہو سکتا ہے، تمھی میں سے کوئی ایک شخص ہو جو روز تمھاری لاش کو پھینک جاتا ہو؟ اسحاق نے ایک اور سوال کیا۔

نہیں سائیں، ہم دیکھتے ہیں کہ قبرستان بڑھتا جا رہا ہے۔ چاروں بولے۔ سائیں کیا آپ ہمیں اس غار کا پتا بتا سکتے ہیں؟ چاروں نے درخواست کی۔

وہ چاروں لمبا، کٹھن سفر طے کر کے بالآخر غار میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کی غار میں اسحاق کی لاش پڑی تھی، اور ایک شیر کی گرج انھیں سنائی دی۔

اب کیا کریں؟ چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لاش کو سب نے باری باری غور سے دیکھا کہ کہیں یہ انھی کی لاش تو نہیں، جو اس مرتبہ گاؤں کے بجائے یہاں پہنچ گئی ہے، مگر وہ اسحاق ہی کی لاش تھی۔ انھوں نے اسحاق کا مرا ہوا چہرہ غور سے دیکھا، پھر اس کا ماتم کیا، پھر اس کی لاش کو نکالا، اور اپنے قبرستان لے گئے، سب گاؤں والوں نے جنازہ پڑھا۔ قبر تیار کروائی اور دفنا دیا۔

اس کے بعد گاؤں میں کوئی لاش نہیں ملی۔

☆☆

واللہ اعلم

اسے وہ کھڑاؤں تو نہ ملی جسے پہننے سے آدمی جہاں چاہے اڑ کر پہنچ سکتا تھا، مگر وہ اس چادر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، جسے مردے پر ڈالنے سے مردہ جی اٹھتا تھا!

دوبارہ جی اٹھنے کا یقین اسے بچپن ہی سے تھا، مگر اس کا یقین دیے کی لو کی طرح لرزتا ہی رہتا تھا۔ کچھ خیالوں اور سوالوں کے جھکڑ اس کے دماغ میں چلتے رہتے تھے۔ وہ سوچتا، اسے جس دنیا کا اب تک تجربہ اور علم ہے، اس میں ہر بات کا ہو سکنا اور نہ ہو سکنا برابر ہیں۔ چیزیں مسلسل اِدھر اُدھر، حاضر غائب ہوتی رہتی ہیں۔ اسے جب بھی دوبارہ جینے کا خیال آتا، اسے لگتا، وہ اسی دنیا کو نئے سرے سے گزارنے لگا ہے جو اس نے اب تک گزاری ہے۔ اسے لذت اور اذیت دونوں ایک ساتھ محسوس ہوتیں۔ اپنے گزرے کل کو ایک بار پھر جینے میں عجب لذت تھی، شاید ویسی ہی جیسی شدہ تنہائی میں دو بدن محسوس کرتے ہیں، لیکن آنے والے کل کا خیال ہی وسوسے لاتا، اذیت سے لتھڑے ہوئے۔ ساٹھ کو عبور کرنے کے بعد اس پر اذیت کے ساتھ ساتھ مایوسی کا غلبہ بھی ہونے لگا تھا۔ وہ زیادہ وقت گزرے کل کو دوبارہ گزارنے میں صرف کرتا، لیکن پھر ایک وقت آتا، اسے لگتا گزرے وقت اور آج میں فرق ہی مٹ گیا ہے، اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے کہ وہ ہے کہاں؟ اس کی اذیت اور مایوسی بڑھ جاتی۔

وہ سوچتا، ہو سکتا ہے، دوبارہ زندگی نہ ملے... ہو سکتا ہے آگے زندگی کے بارے میں اس نے جو کچھ اب تک سنا ہے اس کا مطلب کچھ اور ہو... دوسروں سے سنی ہوئی باتوں کا مطلب ضروری نہیں کہ وہی ہو، جو ہم سمجھ رہے ہیں، دوسرے ہمیں اپنی باتوں کا صحیح علم کہاں دیتے ہیں، دوسروں کو صحیح باتوں

کا صحیح علم کتنا ہوتا ہے؟ پھر یہ بھی ہے ہم ایک ہی بات کو ایک وقت میں کچھ سمجھتے ہیں دوسرے وقت میں کچھ اور۔ اس نے ایک بار اپنے مرشد سے پوچھا تھا (جن کی خدمت میں وہ سال دو سال بعد حاضر ہوا کرتا تھا) وقت سے بچنے کا کوئی راستہ ہے؟ مرشد نے اپنی سفید ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے پہلے کہا تھا نہیں، پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا ہاں۔ اس نے اپنے ہی خیال کو دہرایا: دوسرے ہمیں اپنی باتوں کا صحیح علم کہاں دیتے ہیں، دوسروں کو صحیح باتوں کا صحیح علم کتنا ہوتا ہے؟

اسے کبھی یہ خیال بھی آتا کہ کوئی تو ہوتا جو اس سے براہِ راست باتیں کہتا، اور ان کا مطلب نہ تو سوچنے کی ضرورت پڑتی، نہ پوچھنے کی۔ اس نے ہزار بار تجربہ کیا تھا کہ کسی بات پر ذرا سا سوچنے سے ایک ہی بات کے سو سو مطلب نکلنے لگتے ہیں۔ خدا معلوم یہ مطلب اس بات میں سے نکلتے ہیں یا سوچنے سے۔ اس نے کئی مرتبہ محسوس کیا کہ اس کی کھوپڑی میں سوچنے کی ایک مشین لگی ہوئی ہے، کبھی یہ اتنی تیز چلتی کہ لگتا کوئی آرا ہے جو اسے کاٹ ڈالے گا، اور کبھی اتنی نئی، انوکھی باتیں اس مشین سے نکلتیں کہ اسے سمجھ ہی نہ آتا کہ وہ اتنی ساری باتوں کا کیا کرے؟ اس کی حالت اس دکان دار کی سی ہو جاتی جو ٹھسا ٹھس چیزوں کو دیکھ کر ہی اوبھ جاتا ہو۔ وہ مزید سوچتا، اتنی باتوں، اتنی ٹیڑھی میڑھی باتوں سے، ایک ننھی جان اور ایک دیمک لگی لکڑی کی مانند جسم کا کیا تعلق؟

دوسروں سے باتوں کا مطلب پوچھنے کے عمل کو بالآخر اس نے بے کار سمجھنا شروع کر دیا تھا... اسے مکمل تاریکی کا خیال تو آتا تھا، مگر وہ اس تاریکی کا کیا کرے، جو اسی کے اندر کہیں موجود ہے، مگر وہ اسے محسوس کرنے کے قابل نہ رہے گا..... اس کا دل ڈوب جاتا۔ وہ دنیا کا تصور جب اپنے بغیر کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے سینے پر جیسے ایک پتھر آن پڑتا... اس کی سانس رکتی محسوس ہوتی.... اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکتا تھا۔ پھر خیال آتا اگر دوبارہ زندگی مل بھی گئی، اور اس دنیا کی یادداشت ہی ختم ہو گئی تو... اس امکان کے بارے میں البتہ وہ کچھ سوچ لیتا تھا۔ وہ سوچتا، پرانی یادداشت میں سب کچھ اچھا تو ہے نہیں۔ پھر خیال آتا وہ نئی چیزوں کو پرانی یادداشت کے بغیر کیا سمجھ سکے گا؟ کیا اسے کسی ان جانے دیس کی ان جانی بولی سمجھنی پڑے گی؟ کیا اس میں سیکھنے اور حیران ہونے اور خوش ہونے کی بچے جیسی صلاحیت ہو گی؟

کبھی یہ خیال آتا کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور اسے ہر عمل کا جواب دینا پڑا، اور ان اعمال کا بھی جنھیں وہ یکسر بھول بھال چکا ہے.... کیا اسے اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ وہ گزرے اعمال کو اچھی طرح یاد کر سکے، اور یقین کر سکے کہ یہ واقعی اس سے سرزد ہوئے ہوئے تھے، اور اس نے سب کچھ ہوش مندی کی مکمل حالت میں، اور ہر عمل کے انجام کو سمجھتے ہوئے، انجام دیا تھا.. اسے سب سے بڑا مسئلہ بھول جانا لگتا تھا.... ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ جب وہ تین سال کا تھا تو وہ کہا کرتا تھا وہ بڑا ہو کر دولھا بنے گا... دس سال کی عمر میں وہ بھول بھال چکا تھا کہ اس کی سب سے بڑی آرزو کبھی یہ ہوا کرتی تھی۔ دس سال کی باتیں بیس کی عمر میں بھول بھال گئیں، اور بیس کی باتیں وہ پچاس میں بھول بھال جائے گا... ایک اور مسئلہ بھی اسے پریشان کرتا تھا، جس طرح کسی بات کا ہو سکنا اور نہ ہو سکنا برابر تھا، اسی طرح کسی عمل کے غلط اور صحیح ہو سکنے کا معاملہ تھا..... یہاں کی ترازو اور وہاں کی ترازو میں کیا فرق ہو گا؟ یہاں کی ترازو تو ہر وقت ڈولتی رہتی ہے..... اسے یہ بھی خیال آتا کہ کیا اسے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا موقع دیا جائے گا؟ اگر اسے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو وہ یہ ضرور کہے گا کہ اسے اتنے لمبے، کٹھن سفر پر بھیجتے وقت، اس کی مرضی تو پوچھ لی جاتی! ...مگر وہ یہ سب سوچتے ہوئے ڈر ڈر جاتا... پھر سوچتا، وہ اپنی ہستی سے متعلق اتنے بنیادی، اتنے اہم سوالوں پر سوچتے ہوئے ڈر کیوں جاتا ہے؟.... وہ اتنا کمزور کیوں ہے؟ وہ اپنی کمزوری سے بھی مصالحت کر لیتا، لیکن جوں ہی وہ دوبارہ جی اٹھنے کا یقین کرنے لگتا، اور کچھ دیر کے لیے دیے کی لوٹمٹمانا بند کر دیتی... تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس پر کوئی پہاڑ آن گرا ہے۔ اس پر لرزہ طاری ہو جاتا۔

جب اسے چادر ملی ہے تو اسے لگا کہ اس کی سب الجھنیں دور ہو گئی ہیں۔ لیکن جیسے ہی چادر کے اسرار کھلنے لگے تو نئی نئی الجھنیں پیدا ہونے لگیں۔ سب سے بڑا راز یہ کھلا کہ وہ چادر صرف ایک مردے کو زندہ کر سکتی تھی، تاہم اسے ہر بار زندہ کر سکتی تھی۔ یہ راز کیا کھلا، الجھنوں کی پٹاری کھل گئی۔ ایک الجھن یہ پیدا ہوئی کہ اگر اس نے بتا دیا کہ یہ چادر مردے کو جلا سکتی ہے تو اس کے چوری ہونے کا اسی طرح خطرہ ہے، جس طرح اس نے کسی سے چرائی تھی۔ اس چادر کو چرانے کے سوا، اسے حاصل کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ تھا ہی نہیں۔ دوسری الجھن یہ تھی کہ کیا اس کے بیٹے اور بھائی اس کے مرنے کے

بعد اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش کریں گے؟ ہوسکتا ہے، وہ لالچ میں آجائیں۔ دوبارہ جی اٹھنے سے بڑا لالچ کوئی ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے، ان کا ایمان ڈگمگا جائے، اور وہ اپنے لیے یہ چادر رکھ لیں۔ اس الجھن کا حل اسے نظر نہیں آیا۔ آنے والے وقت میں اس کا اپنا خون کیا سوچے گا، اس کا صحیح علم، وہ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے بھی کہ خود انھیں کہاں معلوم تھا کہ وہ آنے والے وقت میں کیا سوچیں گے؟ لیکن وصیت ضروری تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس پر یہ چادر اس کی لاش پر ڈال دی جائے، اور یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ چادر یہ معجزہ کرسکتی ہے، ورنہ لوگ اسے بھوت سمجھ کر بھاگ جائیں گے، یا اسے مار ڈالیں گے، اور پھر چادر بھی نہیں ڈالیں گے۔ وہ یہ کئی بار دیکھ چکا تھا کہ ایک مریض، مجروح، بوڑھے کو بچانے کی کوشش سب کرتے ہیں، مگر وہی آدمی مرجائے تو اس کے دوبارہ جی اٹھنے کی تدبیر تو دور کی بات ہے، اس کے جسم کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتے ہیں۔

اس نے وصیت کیا کی کہ چند دنوں بعد پوری بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ اس کے پاس مردے کو زندہ کردینے والی چادر ہے۔ خبر کیا پھیلی، بستی پر ایک مصیبت نازل ہوگئی، اور خود اس پر بھی۔ ایک امام صاحب کا آخری وقت تھا، انھوں نے اپنے بیٹوں اور ارادت، مندوں کو اس کے پاس بھیجا کہ اس چادر کے سب سے بڑے مستحق وہی ہیں۔ اگر وہ چلے گئے تو بستی پر گناہ و ادبار پھر چھا جائے گا، اس لیے ان کا زندہ رہنا بستی والوں کے لیے ضروری ہے۔ اسے بستی کے گناہ و ادبار سے پریشانی تو ہوئی، ایک لمحے کو ڈگمگایا بھی مگر پھر یہ سوچ کر اس نے انکار کردیا کہ جب یہ امام صاحب نہیں تھے، تب بھی تو یہ بستی آباد تھی۔ پھر خود اسے بھی دوبارہ جینے کا لالچ اس قدر تھا کہ اگر اس کا اپنا بیٹا بھی اس کے سامنے مرجاتا تو اسے اس نے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلینا تھا۔ جب تیل سیدھی انگلی سے نہیں نکلا تو امام صاحب کے ارادت مندوں نے وہ چادر چرانے کا فیصلہ کرلیا، حالاں کہ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ چادر حاصل کرنے کا صحیح طریقہ ہی یہی تھا۔ اسے بھی بھنک پڑگئی۔ اس کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ وہ جاگ جاگ کر اس قدر زچ ہوگیا کہ اس کا جی چاہا، وہ مرجائے۔ وہ واقعی مرنا چاہتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کا اپنے بیٹے پر یقین بھی ڈانواں ڈول تھا؛ خدا جانے بیٹا اس کی وصیت پر عمل کرے یا نہ کرے۔ ہوسکتا ہے اس کا بیٹا چاہے کہ اس کے سر پر باپ کا سایہ سلامت رہے، ہوسکتا ہے بیٹا چاہے کہ بڈھا اب جان

چھوڑے۔ جب وہ خود شش و پنج میں ہے تو بیٹے کا ذہن کیسے پڑھ سکتا ہے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ اس وقت اس کا بیٹا جو کچھ سوچ رہا ہے، جب وہ باپ کی لاش دیکھے تو وہی کچھ سوچے یا کچھ اور۔ ایک موٹی سی گالی اس نے دماغ کو دی۔ وہ سوچتا سوچتا جانے کیسے کچھ پل کے لیے سوگیا، اور اسی دوران میں چادر چوری ہوگئی۔ اسی کے آس پاس امام صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ امام صاحب کے ارادت مندوں نے وہ چادر نکالی، لیکن جوں ہی ان پر ڈالنے لگے، وہ پہنچ گیا، اور سب کو مخاطب ہوکر بولا۔ یہ کون سا انصاف ہے کہ ایک نیک آدمی کو سفید لٹھے کا کفن دینے کے بجائے، سبز رنگ کی چادر دی جائے۔ پھر یہ چادر چوری کی ہے۔ کیا امام صاحب کے عقیدت مند ان کی نعش پر کھڑے ہوکر، باوضو ہوکر مقدس کتاب کی قسم اٹھا کر کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے یہ چادر میرے گھر سے چوری نہیں کی۔ عقیدت مندوں نے کہا رب کو جان دینی ہے، ایک نعش پر اور وہ بھی امام صاحب جیسی نیک ہستی کی نعش پر جھوٹ کیسے بولیں۔ انھوں نے اعتراف کرلیا کہ یہ چادر چوری کی ہے۔ امام صاحب کو سفید کفن میں دفنا دیا گیا۔ اب جن کو نہیں پتا تھا، ان کو بھی پتا چل گیا کہ ایک چادر ایسی ہے، جسے مردے پر ڈالنے سے مردہ جی اٹھتا ہے۔ ارد گرد کی بستیوں سے بات ہوتی ہوئی، دوسرے دیسوں میں بھی پھیل گئی۔ ایک آدمی نے رائے ظاہر کی کہ اس چادر سے ایک ایک دھاگہ نکال کر سب لوگوں میں تقسیم کردیا جائے، اور اس دھاگے کو کفن میں ٹانک دیا جائے، ہوسکتا ہے کہ چادر کی کرامت اس کے ایک ایک دھاگے میں ہو، مگر وہ نہیں مانا۔ اسے جانے کیوں یقین تھا کہ چادر کی حالت میں معمولی سی تبدیلی سے چادر کی حقیقت بدل جائے گی، اور یہ واحد یقین تھا جو دیے کی لو کی مانند نہیں تھا!

ہر کوئی اس چادر کو حاصل کرنا چاہتا تھا، اور ہر قیمت پر۔ وہ لوگ بھی جو مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان کا ذکر دن رات کرتے تھے، اس چادر کو حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی حد پار کرنے کو تیار تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے بھاری قیمت کی پیش کش بھی کی۔ ایک شخص نے کہا کہ وہ اس چادر کے بدلے اپنی بیٹی اس کے ساتھ بیاہنے کو تیار ہے۔ اس کے جی میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ وہ کوئی دوسری چادر دے کر بیاہ کرلے، لیکن ڈر گیا، اگر راز کھل گیا تو مرنے سے پہلے مار دیا جائے گا۔ ایک زمیندار نے اسے پانچ مربع زمین کی پیش کش کی۔ ایک بوڑھا کروڑ پتی اسے اپنی ساری دولت دینے پر تیار

- کہانی ہمیں وجود کی سچائی سے آگاہ کرتی ہے، مگر ایک کام ہمیں کرنا ہوتا ہے، اور وہ ہے، اپنی سچائی کا بوجھ اٹھانا اور اپنی سچائی کو قابل پرسش سمجھنا۔ ہر مصنف، کہانی لکھتے ہوئے، خدا کے منصب پر ہوتا ہے... خدا ہونا ایک بات ہے، خدا کا منصب اختیار کرنا دوسری بات ہے۔ خدا کا منصب، خدا کے حقیقی اختیار کے بارے میں قائم کیے گئے انسانی تصور کی نقل ہے۔
- آدمی کو بھلانا ممکن ہے، مگر آدمی کے قتل سے جو بھیانک پن پیدا ہوتا ہے، اسے کون بھلا سکتا ہے؟
- میں دل وجان سے یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ آدمی کی عقل، آدمی ہی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ آدمی کا جسم آدمی ہی کی قدرت سے باہر ہو سکتا ہے۔ یا خدا، میں یہ کس سے پوچھوں کہ آدمی کے جہل کا.... بے خبری کا.... بے بسی کا.... تکبر کا... کوئی کفارہ ہوتا ہے؟
- اس کا دل اس تقدس سے بھر گیا تھا، جو کچھ بڑی سچائیوں کے ظاہر ہونے سے از خود پیدا ہوتا ہے، اور یہ بڑی سچائیاں ظاہر ہونے کے لیے صرف بڑے لوگوں کا انتخاب نہیں کرتیں، بلکہ یہ کسی شخص کی اوقات کو سرے سے دیکھتی ہی نہیں، صرف کچھ مخصوص حالات کا انتظار کرتی ہیں۔
- میں رحل پر تمھیں الف لیلہ نہیں رکھنے دوں گا۔

  کون رحل پر الف لیلہ رکھ رہا ہے۔ زمین پر، میز پر یا گود میں تو الف لیلہ رکھی جا سکتی ہے۔
- اللہ، گھڑی گئی کہانی میں اتنے بڑے بڑے سچ کیسے سما جاتے ہیں!... اب مجھے لگتا ہے کہ اس سے زیادہ ظلم اور کوئی نہیں کہ آدمی اپنی ان چھوٹی چھوٹی دریافتوں کو نظر انداز کرے۔ انھی چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعے کوئی بہت ہی بڑی ہستی ہم سے کلام کرتی ہے۔
- آدمی سب بھول سکتا ہے، اپنے پرکھوں سے لے کر اپنے آبائی مذہب تک کو، نہیں بھول سکتا تو اس خاک کی مہک کو۔ سو سال کی عمر میں بھی وہ مہک پہلے دن کی طرح تر و تازہ رہتی ہے۔ نہیں، اس کی تازگی بڑھتی رہتی ہے۔
- سچ اگر ہتھیلی ہے تو جھوٹ اس کا پچھلا حصہ ہے۔ جنھوں نے ہتھیلی کا تھپڑ اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ کھایا ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ الٹے ہاتھ کا درد زیادہ ہوتا ہے..... ہر بڑے جھوٹ میں ہمارے بڑے بڑے سچ ہو سکتے ہیں۔ تو بھائیو، یہ جھوٹ کا فیسٹول، بڑے سچ کا جشن ہی سمجھو۔
- دنیا میں کوئی جگہ ہوگی جہاں ہمارے آم، سنگترے بک سکتے ہیں، پڑھے لکھے لوگ بک سکتے ہیں تو کہانیاں کیوں نہیں؟ شرط یہ ہے کہ آموں کی طرح تمھاری شہری زبان میں نیٹو ہوں۔
- معلوم نہیں مرنے کے بعد مائیں کہاں جائیں گی؟ ماؤں کے بغیر وہ دنیا کیسی ہوگی؟ جسے عورت کے بجائے ماں چاہیے ہوگی، وہ کیا کرے گا؟
- دوسرے ہمیں اپنی باتوں کا صحیح علم کہاں دیتے ہیں، دوسروں کو صحیح باتوں کا صحیح علم کتنا ہوتا ہے؟

(کتاب میں شامل افسانوں سے مقتبس)

- ڈاکٹر ناصر عباس نیر اردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ انھوں نے تھیوری، جدید اردو نظم و فکشن اور کلاسیکی و جدید اردو ادب کے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کیے ہیں، اور آخر الذکر میں ان کی حیثیت بنیاد گزار کی ہے۔ خاک کی مہک، ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ خاک وطن و خاک وجود سے تعلق کی بازیافت کرتے ہوئے، بنیادی انسانی وجودی سوالات تک پہنچنا، اور گہری نفسیاتی بصیرتوں اور سماجی و سیاسی مسائل کی گرہوں کو کھولنا، اور ہر جگہ کہانی کی شعریات کا لحاظ رکھنا، اور کسی خاص بیانیہ اسلوب تک محدود نہ رہنا... ان افسانوں کی خصوصیت ہے۔

Rs. 700.00

www.sangemeel.com